اگست ۱۹۷۶ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جلد ۲۴ — وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین — عدد ۱

تنظیم اسلامی کا ترجمان

اور دعوت تجدید ایمان و توثیق میثاق الست کا علمبردار

ماہنامہ میثاق لاہور

اس شمارے کے مشمولات

● عرض احوال	اسرار احمد	کور کا صفحہ ۲
● کلا انها تذکرہ	مولانا امین احسن اصلاحی	۱
● ارشاد باری تعالیٰ ، چند نشری تقریریں	اسرار احمد	۱۷
● حفاظت متن قرآن (۴)	حافظ احمد یار صاحب	۳۱
● قرآنی تعلیمات اور ایک عصری فلسفیانہ تحریک	ڈاکٹر ابصار احمد	۴۲
● ضمیمہ : دستور تنظیم اسلامی		مشتمل بر ۳۶ صفحات

مدیر :

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات :

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۱۲- افغانی روڈ ، سمن آباد - لاہور

(فون : ۴۱۳۹۴۵)

چندہ سالانہ ۱۵/- — قیمت فی نسخہ ۲/-

عرض احوال

تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام ' میثاق ' کا یہ پہلا شمارہ شائع ہو رہا ہے ۔ خیال یہ تھا کہ اس موقع پر ایک مفصل اداریہ سپرد قلم کیا جائے ۔ اور اس کا خاکہ بھی ذہن میں بالکل تیار تھا ۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول ' عرفت ربی بفسخ العزائم ' کے مصداق اللہ کا فیصلہ یہی معلوم ہوا کہ اس ارادے پر عملدرآمد قدرے موخر ہو جائے ۔

در اصل پچھلے ڈیڑھ دو ماہ کے دوران میں راقم الحروف اپنے بعض انتہائی قریبی اعزہ کی علالت کے باعث بے حد پریشان بھی رہا اور مسلسل سفر پر بھی ۔ بڑے بھائی صاحب کے ایک بچے کی آنکھ میں چوٹ آ گئی تھی پہلے اس کا آپریشن ہوا ۔ پھر ایک چھوٹے بھائی کی اہلیہ شدید علیل ہو گئیں اور ان کا بھی آپریشن ہوا ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے پھوپھی زاد بھائی شیخ نصیر احمد کا ایک بہت بڑا آپریشن ہوا ۔ اور وہ تقریباً بیس روز موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہ کر بالآخر راہئی ملک بقا ہو گئے ' انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ میں جملہ قارئین ' میثاق ' سے اپنے علیل اعزہ کے لئے دعائے صحت کا بھی خواستگار ہوں اور خاص طور پر مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کا مستدعی ہوں۔ ان کا ایک خصوصی تعلق اس ' تحریک دعوت رجوع الی القرآن ' سے جس کے کوکھ سے تنظیم اسلامی بر آمد ہوئی ہے یہ ہے کہ جنوری ۶۸ء میں لاہور میں میرے حلقہ ہائے درس قرآن کا آغاز انہی کے مکان سے ہوا تھا ۔ اور انہوں نے بڑے ذوق اور شوق کے ساتھ اس کام میں تعاون کیا تھا ۔ یہاں تک کہ جب حاضری اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کے مکان کے ہال کمرے میں نہ سما سکتی تھی تو باہر لان میں بیٹھ کر درس سننے والوں کے لئے ایک لاؤڈ سپیکر بھی انہوں نے اپنی جیب خاص ہی سے خریدا تھا ۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے !

راولپنڈی ۔ اسلام آباد میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام جو قرآنی تربیت گاہ ۸ تا ۱۵ ۔ اگست منعقد ہو رہی ہے اس کے ساتھ ہی تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام ایک اقامتی تربیت گاہ کا اہتمام بھی کیا گیا ہے ۔ جس میں جملہ رفقائے

(بقیہ کور کے صفحہ ۳ پر)

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ

مولانا امین احسن اصلاحی

کا ایک بصیرت افروز خطبہ

جو موصوف نے

۱۳ - اگست ۷۶ء کو جامع مسجد خضرا، سمن آباد لاہور میں اس دس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے افتتاحی اجلاس میں ارشاد فرمایا جس میں ڈاکٹر اسرار احمد نے مطالعہ قرآن حکیم کے اپنے مرتب کردہ منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس دیا۔ اور مولانا عبدالغفار حسن استاذ حدیث، جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ نے درسِ حدیث دیا!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بھائیو! میں سب سے پہلے اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس اجتماع میں برکت دینے کے لئے نہیں بلکہ برکت لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ میری حاضری کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ میں اپنے مخدوم اور محترم دوست مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے درس سے کچھ برکت حاصل کروں۔ برکت حاصل کرنا، میں نے اس لئے عرض کیا ہے کہ میں اب استفادہ کے قابل تو رہا نہیں صرف برکت ہی حاصل کر سکتا ہوں۔ مولانا سے مجھے صرف محبت ہی نہیں ہے بلکہ بلاشائبۂ تکلف عرض کرتا ہوں کہ مجھے ان سے عقیدت بھی ہے۔ درآنحالیکہ عقیدت کے

معاملے میں مَیں بہت فیاض آدمی نہیں ہوں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مجھے ان سے محبت ہی نہیں بلکہ عقیدت بھی ہے اور میں آپ لوگوں کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ آپ کو ان کے درس سے اور ان کی صحبت سے زیادہ استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔

میری حاضری کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ آپ کی صحبت اور آپ کی معیّت کا تھوڑا بہت ثواب میں بھی حاصل کر لوں۔ اس زمانہ میں ایسے انسانوں کی تو کمی نہیں ہے جو ارسطو کی تعریف کے مطابق انسان ہیں اسلیئے کہ بہرحال وہ "حیوان ناطق" ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بس حیوان ناطق ہی ہیں، قرآن کی تعریف کے مطابق وہ انسان نہیں ہیں اس لئے کہ وہ بصیرت اور بصارت دونوں سے محروم ہیں۔ فی زمانہ ایسے انسان بہت ہی تھوڑے ہیں جو اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے جدوجہد کریں، اس کے لئے گھر سے نکلیں، اس کے لئے تکلیفیں اٹھائیں، اس کے لئے ان کے اندر ذوق شوق ہو۔ میں آپ لوگوں کو انہی میں شمار کرتا ہوں جو ایک نہایت ہی محبوب اور عظیم مقصد کے لئے گھر سے نکلے ہیں۔ اللہ تعالےٰ آپ کے اس ارادے میں خیر و برکت عطا فرمائے اور آپ کو زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہونے کا موقع دے۔

حضرات! میرا ارادہ تو یہی تھا کہ میں شرکت کے ذریعے برکت حاصل کروں لیکن میرے عزیز بھائی شیخ سلطان احمد صاحب اور برادر عزیز ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مجھے یہ خواہش بھی معلوم ہوئی کہ میں آپ کے سامنے تقریر بھی کروں، تو میں نے ان کی خواہش کی تعمیل ضروری سمجھی، لیکن میں جو کچھ عرض کروں گا اس کی نوعیت ہرگز تقریر کی نہیں ہوگی بلکہ چند نہایت ہی واضح اور بدیہی حقیقتوں کی "تذکیر" ہی کی ہوگی۔ یعنی صرف یاددہانی حقیقت یہ ہے کہ بعض حقیقتیں اپنی جگہ انتہائی واضح ہوتی ہیں لیکن شاید اپنی شدتِ وضاحت ہی کی وجہ سے بہت مجہول ہو جاتی ہیں لہٰذا ان کی وقتاً فوقتاً تذکیر ہوتی رہنی چاہیئے۔ میری اپنی زندگی کی رہنمائی میں ان حقائق نے بہت مدد دی ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر آپ کو بھی ان کی یاددہانی کرا دوں تاکہ آپ حضرات بھی ان سے فائدہ اٹھائیں۔

خدا کا وجود ایک بدیہی حقیقت ہے

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا ہے اور ضرور ہے اور خدا کے ماننے پر ہر انسان مجبور ہے۔ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ میں اس معاملہ میں اپنا یہ ذاتی احساس عرض کر دیتا ہوں کہ جب اوّل اوّل مجھے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ خدا ہے اور ضرور ہے۔ تیز یہ کہ انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا اور اس سے مفر نہیں ہے تو اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی ادراک ہوا کہ اس کو ماننے سے بہت بھاری ذمہ داریاں انسان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ جب کبھی میں ان ذمہ داریوں کے متعلق سوچتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا بوجھ میری کمر توڑ دے گا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کچھ فلسفی ایسے بھی ہیں جو خدا کا انکار کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مجھے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی چیزوں کا بھی مطالعہ کروں اور صاف طور پر عرض کئے دیتا ہوں کہ بغیر کسی تعصب کے میں نے ان چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر یہ چھپی ہوئی خواہش بھی موجود تھی کہ اگر یہ فلسفی یہ ثابت کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا اس لئے کہ اس طرح بہت بڑے بوجھ سے نجات مل جائے گی۔ یہ ایک مخفی راز ہے جو میں آپ پر ظاہر کر رہا ہوں۔ ویسے الحمد للہ مجھ پر الحاد کا کوئی دور نہیں گزرا ہے۔ لیکن مجھ پر ایک ایسا دور ضرور گزرا ہے کہ جب میرے اندر یہ خواہش تھی کہ اگر یہ فلسفی حضرات خدا کا انکار ثابت کر دیں اور مجھے مطمئن کر دیں کہ خدا نہیں ہے تو بہر حال ایک اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملے گا اور ایک بھاری بوجھ اتر جائے گا۔ اس خواہش کے تحت میں نے متکلمین کی، دہریوں کی، منکرین کی، ڈارون کی، مارکس کی، فرائڈ کی، غرض کہ ان سب لوگوں کی کتابیں بڑی دلچسپی سے پڑھیں اور بغیر کسی تعصّب کے پڑھیں، لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ ساری چیزیں پڑھنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ سب خرافات ہیں۔ ایک بدیہی حقیقت سے انکار کی خواہش ان سے یہ کام کرا رہی ہے، باقی رہ گیا یہ کہ خدا کے انکار کے لئے ان لوگوں کے پاس واقعی کوئی دلیل ہے تو اس کی سرے سے گنجائش ہی نہیں۔

جو بات یہ پیش کرتے ہیں، اس سے ہزار گنا مضبوط اور بدیہی بات وہ ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ کہ ایک خدا کو، ایک رب کو، ایک رحمان کو، ایک رحیم کو، ایک علیم کو، ایک خبیر کو، ایک سمیع کو اور ایک بصیر کو مانو۔ اس بات پر عقل بھی گواہی دیتی ہے اور فطرت بھی گواہی دیتی ہے۔ ظاہر بھی گواہی دیتا ہے اور باطن بھی گواہی دیتا ہے۔ آفاق بھی گواہی دیتے ہیں اور انفس بھی گواہی دیتے ہیں۔ غرض کہ ایک ایک چیز گواہی دیتی ہے۔ ہمارے متکلم اور ہمارے فلسفی لوگ خدا کے وجود پر اگر کوئی دلیل قائم کر نہیں پاتے تو جانتے ہو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دلیل وہاں کام دیتی ہے جہاں دلیل دعویٰ سے زیادہ واضح ہو لیکن اگر دعویٰ دلیل سے زیادہ واضح ہو تو وہاں دلیل بے کار ہے۔ وہاں دلیل کیا کام کرے گی؟ وہاں ارسطو کی منطق کیا کام کر سکتی ہے؟ وہاں متکلمین کا علم کلام کیا کام کر سکتا ہے؟ سورج کے وجود پر آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں؟ چاند کے لئے آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں؟ اسی طرح آسمان اور زمین کے وجود پر آپ کیا دلیل لا سکتے ہیں۔ ان چیزوں پر دلیل لانے کی کوشش کرنا درحقیقت حماقت ہے۔ یہ بدیہیات ہیں۔ فطرت کی، آفاق کی، انفس کی، عقل کی سب کی بدیہیات! اس مطالعہ سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ محض انکار کرنے کی خواہش کے زیر اثر اندھے اور بہرے ہو گئے ہیں اس لئے کہ وہ جس علت العلل کو، جس محرک اول کو، جس مادہ کو، جس خلیہ کو، اس عظیم کائنات کا سبب قرار دیتے ہیں، اس سے زیادہ اور اس سے لاکھ درجہ آسان اور عقل اور دل کے لیے قابل قبول بات وہ ہے جو قرآن کہتا ہے۔ میں اس کائنات کو کسی محرک اول کی حرکت کا نتیجہ مان لوں! اس حماقت میں مبتلا ہونے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ میں یہ مان لوں کہ بیشک خدا ہے اور ان ہی صفات کے ساتھ ہے جو قرآن کہتا ہے۔

خدا کا انکار حقیقت سے فرار ہے

تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں، وہ درحقیقت خدا کو ماننے کی جو عظیم ذمہ داریاں انسان کے اوپر عائد ہوتی ہیں ان سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں

اس کے سوا کوئی اور وجہ نہیں ہے۔ اور اس میں واقعۃً کوئی شک نہیں ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد جو عظیم ذمہ داریاں انسان کے اوپر عائد ہوتی ہیں، وہ بڑی اہم ہیں۔ بڑی مشکل ہیں، بڑی کٹھن ہیں اور بڑی دشوار ہیں۔ اس راہ میں آگے بڑھنا، صرف اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب کہ آدمی سر ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھے۔ اس میں حضرت یحییٰ کی طرح سر کٹوانا پڑتا ہے۔ حضرت مسیحؑ کی طرح سولی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی طرح آگ میں کودنے کے لیے تیار ہونا پڑتا ہے اور ان تمام مراحل و مقامات سے گزرنا پڑتا ہے جن مراحل اور مقامات سے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ گزرے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے ہر شخص ہمت نہیں رکھتا اور اسی لیے لوگ گریز اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ صاف صاف انکار کر دیتے ہیں کہ ہم ان جھگڑوں ہی میں نہیں پڑتے۔ وہ ان بدیہی حقیقتوں کو "موہوم" کہہ کر گویا ذمہ داریوں سے بچنے کا آسان راستہ نکال لیتے ہیں اور جو لوگ مانتے ہیں جیسے کہ ہم اور آپ، ہماری قوم۔ وہ درحقیقت اقرار مع انکار کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ خدا کو مانتے ہیں لیکن خدا کو ماننے کے جو تقاضے ہیں ان میں سے کسی تقاضا کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ پھر اس کے بعد تقاضوں سے فرار کے لیے طرح طرح کے حیلے اور بہانے اختیار کر لیتے ہیں۔ بڑے فخر اور تعلّی کے ساتھ خدا کا اقرار بھی کرتے ہیں لیکن زندگی کے کسی مرحلہ میں خدا کے اقرار کے تقاضوں کو پورا کرنے اور خدا کے احکام پر بے چون و چرا عمل کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر دوسرے صریح اور کامل انکار میں مبتلا ہیں تو یقیناً ہم بھی اقرار مع الانکار میں مبتلا ہیں اور ہماری پوری قوم مبتلا ہے۔

خدا کو ماننے کے تقاضے اور لوازم

اصل چیز یہ ہے کہ خدا کو مانئے تو خدا کو ماننے کے جو مطالبے ہیں، جو تقاضے ہیں، جو تضمنات ہیں، جو مضمرات ہیں، جو لوازمات ہیں، جو نتائج ہیں ان کا مواجہہ کرنے کے لیے تیار رہیے۔ حقیقت سے گریز کی پالیسی نہایت بزدلانہ بلکہ منافقانہ ہے

اور قرآن کے مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ مآل کے لحاظ سے کفر اور نفاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے مابین فرق صرف ظاہر کا فرق ہے۔ نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا انجام ایک ہے۔ تو جو لوگ انکار میں مبتلا ہیں وہ تو انکار میں مبتلا ہیں ہی لیکن جو لوگ اقرار والے انکار میں مبتلا ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ وہ صریح نفاق میں مبتلا ہیں۔ اب اس صریح نفاق کو اپنے اندر سے نکالنا ایک بڑا معرکہ ہے اور دوسروں کے اندر سے نکالنا اس سے بھی بڑا معرکہ ہے۔ اللہ جن کو ہدایت بخشتا ہے وہ نفاق کو اپنے اندر سے نکال سکتے ہیں اور جن کی ہدایت میں، جن کی توفیق میں زیادتی فرماتا ہے وہ دوسروں سے اس کو دور کرنے کی سعی و جہد کرتے ہیں لیکن اس کے لیے بڑی سخت بازی کھیلنی پڑتی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ حقیقت سے گریز کی پالیسی بالکل غلط ہے۔ حقیقت کا مواجہہ کیجئے اور پوری جرأت کے ساتھ مواجہہ کیجئے اور وہی بندے مبارک بندے ہیں جو یہ کام کریں۔ اللہ تعالیٰ کو بہت ساری بھیڑ مطلوب نہیں، وہ تو مُکھّن چاہتا ہے۔ اسے تو وہ بندے پسند ہیں جو اس کو اس طرح مانیں جیسے کہ اس کو ماننے کا حق ہے۔ مولویوں کی زبان میں سننا چاہیں تو سنئے کہ "مانیں ماننا کر" سر دینے کے لیے تیار ہو کر مانیں۔ یوحنا و مسیح کی طرح مانیں، محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے صحابہؓ کے طریقہ سے مانیں۔ باقی اس کے سوا دوسرا طرزِ عمل مہمل اور خرافات ہے۔

صبر اور عزیمت کی ضرورت

پس حق کو جانیئے، حق کو سمجھیے، حق کا علم حاصل کیجئے، حق کی معرفت حاصل کیجئے اور پھر اس حق کو اپنے اوپر قائم کرنے کے لیے اور دوسروں پر قائم کرنے کے لیے اپنے اندر صبر اور عزیمت پیدا کیجئے۔ اسی حق اور اسی صبر پر حقیقت میں صحیح زندگی قائم ہوتی ہے۔ جہاں تک حصولِ علم و معرفت کا تعلق ہے تو یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ نبیوں کی تعلیم، نبیوں کے صحیفے، اللہ کا شکر ہے موجود ہیں۔ اللہ کی آخری کتاب قرآن بتمام وکمال موجود ہے، آخری نبیؐ کی سُنّت

موجود ہے، صحابہؓ کی زندگی موجود ہے۔اگر آپ جاننا چاہیں اور آپ میں جاننے کا شوق اور طلب ہو، جس طرح زندگی کی اور طلبیں ہیں، تو یہ کام بہت مشکل نہیں ہے، لیکن صبر کا معاملہ بہت مشکل ہے۔یہ میری زندگی کا تجربہ ہے کہ صبر کا معاملہ واقعی بہت مشکل ہے، عزیمت کا معاملہ بہت مشکل ہے۔مَیں اس صبر کے متعلق عرض نہیں کر رہا ہوں جس کے کھوکھلے وعظ ہمارے منبروں سے ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ صبرِ حقیقی، عزیمت، استقامت سے میری مراد یہ ہے کہ اللہ کو ماننے اور حق کو تسلیم کرنے کے جو حقیقی تقاضے ہیں ان کو پورا کیا جائے۔جس حق کو قبول کیا جائے اُس کی اپنے قول و فعل سے شہادت بھی دی جائے۔یہ ہر مومن کا فرض ہے اوّلین فرض ہے۔

شہادتِ حق واجب اور لازم ہے

جس شخص میں حق کی طلب نہ ہو حق کا علم حاصل کرنے کا شوق نہ ہو۔اُسے آپ ارسطو کی تعریف کے مطابق انسان کہہ دیجئے لیکن مَیں تو اُسے دو ٹانگوں پر چلنے والا جانور ہی سمجھتا ہوں[1]۔میرے نزدیک وہ حقیقت میں انسان نہیں ہے، جس میں حق کی طلب نہ ہو، جس کا عظیم داعیہ انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔جس کے اندر یہ داعیہ نہیں ہے وہ مُردہ ہے، وہ آدمی نہیں ہے، بلید ہے اور جانور سے بھی زیادہ بلید ہے[2]۔ لہٰذا اس حق کو قائم کرنا بہت بڑی سعادت ہے پہلے تو اس حق کو اپنے اوپر قائم کیجئے اس لیے کہ جس نے اپنے اوپر اس حق کو قائم نہیں کیا اس کا حق کی شہادت دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہونا فضول کام ہے۔ ایسے کھوکھلے سینوں کی شہادت کچھ کارگر نہیں ہوتی، بالکل بے کار ہوتی ہے۔صرف اُن ہی لوگوں کو حق کی شہادت پیش کرنے کا حق ہے جو حق کو پہلے اپنے اوپر قائم کرلیں۔اور اچھی طرح جان لیجئے کہ حق کی شہادت دینا بھی فرض ہے۔حق کو جاننے والے اور علمِ صحیح رکھنے والے کے لیے مَیں دین میں اور قرآن کے تیس پاروں میں کہیں کوئی

---

[1] اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ [2] بَلْ هُمْ اَضَلُّ

گنجائش نہیں پاتا کہ اسے حق کی شہادت دینے سے مفر ہو۔ شہادتِ حق اس پر واجب ہے، لازم ہے، فرض ہے۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے، جس حد تک ممکن ہو حق کی شہادت دیجئے۔

لیکن جب شہادت کا مرحلہ آتا ہے تو بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اس کے لیے بسا اوقات ایسے ایسے لوگوں کے کانوں میں حق کی اذان دینی پڑتی ہے جن کے کانوں میں یہ اذان دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ بڑے عزیز تعلقات اس کے لیے منقطع ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے عزیز رشتے اس کے لیے کٹ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے محبوبوں کی دوستی اس کے لیے قربان کرنی پڑتی ہے اور بسا اوقات سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ آخری چیز جان ہے، اس کی بھی نذر گزارنی پڑتی ہے اور صاف سن لیجئے کہ اگر آپ جان کو عزیز رکھتے ہوں تو اس راستہ میں بالکل قدم نہ رکھیے۔ یہ وہ راستہ نہیں جس میں آسانیاں ہوں۔ اس راستہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں ان تمام مشکلات کو بیان کروں۔ آپ قرآنِ کریم کا جو درس حاصل کریں گے ان سے یہ مشکلات معلوم ہو جائیں گی۔

صبر کی بنیاد

لیکن میرے عزیز دوستو! ایک بات میں آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں، اور کاش میں اُسے اچھی طرح آپ کو سمجھا بھی سکوں۔ وہ بات یہ ہے کہ 'صبر' کہنے کے لیے بہت آسان ہے، لیکن کرنے کے لیے بہت مشکل ہے اور پھر یہی وہ چیز ہے جس پہ صحیح زندگی استوار ہوتی ہے۔ جہاں تک اہلِ حق کا تعلق ہے، شہادتِ حق دینے والے لوگوں کا تعلق ہے، ان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ صبر کی بنیاد ایک علمی حقیقت پر ہے، ایک حکمت پر ہے۔ جب تک وہ حقیقت و حکمت پوری طرح سے واضح نہ ہو، اس پر علم الیقین اور حق الیقین نہ ہو تو اس وقت تک صبر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت و حکمت یہ ہے کہ آپ کے راستہ میں جو کچھ پیش آئے گا وہ اللہ کے ارادہ اور مشیّت کے تحت پیش آئے گا۔ اللہ کے ارادہ اور مشیّت کے سوا اس دنیا میں اور کوئی ارادہ اور مشیّت کارفرما نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر ارادہ میں خیر مضمر ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمیں اس کا خیر معلوم نہ ہو۔ اسی حقیقت کو سمجھنے کے لیے حضرتِ موسیٰ علیہ السّلام کو حضرت خضرؑ کی تلاش میں نکلنے کا حکم ہوا۔ اس کو خوب اچھّی طرح سمجھ لیجیئے کہ جب تک آپ اس حقیقت کو مستحضر نہیں رکھیں گے آپ کی اندرونی زندگی میں اور آپ کی خارجی زندگی میں ایسے ایسے فتنے پیش آئیں گے کہ شیطان آپ کو لوٹا دے گا، آپ کے قدم متزلزل ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اس حقیقت پر آپ کا مضبوط یقین ہے کہ جو ہوگا خدا کے ارادہ سے ہوگا اور خدا کا ارادہ ہمیشہ خیر اور حکمت ہی پر مبنی ہوتا ہے تو آپ یقین کریں کہ آپ بڑے سے بڑے مشکل مرحلہ میں بھی ثابت قدم رہیں گے۔ رہی یہ بات کہ خدا کا ہر ارادہ خیر پر مبنی ہے اور خدا کے ارادہ کے سوا کوئی دوسرا ارادہ اس اس کائنات میں کارفرما نہیں ہے تو یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ جو اس کو نہیں مانتا وہ مومن نہیں۔ اس کو سمجھنے کی دو شکلیں ہیں یا یہ کہ ہر کام کی حکمت ہمارے اوپر عیاں اور واضح ہو جائے۔ جس کا کوئی امکان نہیں اس لیے کہ ہم خدا تو نہیں بن سکتے۔ ہم بندے ہیں، ہمارا علم محدود ہے یا پھر یہ کہ ہم اس بات پر یقین رکھیں کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں خدا کی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ کچھ کی حکمت ہماری سمجھ میں آجاتی ہے اور کچھ کی حکمت اپنے محدود علم کی وجہ سے ہم سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ ہر کام میں خیر و حکمت پوشیدہ ہوتی ہے تو اس پر پورا پورا ایمان اور یقین رکھیں۔ خدا چاہے گا تو وہ آپ پر حکمت بھی واضح کر دے گا، لیکن حکمت جاننے کے لیے ہم کو بے صبر نہیں ہونا چاہیئے۔ ہوسکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ ظالموں کی گرتی ہوئی دیوار، باغیوں اور طاغیوں کے گرتے ہوئے وقار کو سنبھالا دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی خدا کی حکمت ہی کارفرما ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس راستہ میں آپ دیکھیں کہ اہلِ حق مظلوم ہیں مقہور ہیں۔ ان کو ستایا جا رہا ہے، ان کو دُکھ دیا جا رہا ہے، وہ فاقے کر رہے ہیں۔ یہ باتیں بھی آپ دیکھیں اور اس پر یہی یقین رکھیں کہ اس میں بھی خدا کی کوئی حکمت ہوگی۔ یہاں مسکینوں کی کشتی میں سوراخ کرا دیا جاتا ہے تو اس کے اندر بھی حکمت مضمر ہوتی ہے۔

ظالموں اور باغیوں کی دیوار اونچی کرادی جاتی ہے تو بہرحال اس دیوار کے نیچے غریبوں اور یتیموں کا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ ظالموں اور طاغیوں کو جو مہلت دی جاتی ہے، اس کے اندر کیا کیا حکمتیں ہیں۔ تو ان میں سے کچھ کا اندازہ آپ کو قرآن مجید کے مطالعہ سے ہوگا اور اصل حقیقت تو قیامت کے دن ہمارے سامنے آئے گی۔

بہرحال ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ اگر حق کی راہ میں کسی پر ظلم ہوتا ہے تو اسی کے اندر حکمت ہے، اسی کے اندر بہتری ہے، اسی کے اندر خیر ہے اسی کے اندر فلاح ہے اور اسی کے اندر کامیابی ہے۔ اور اگر ظالموں کو، طاغیوں کو، سرکشوں کو، نافرمانوں کو، باغیوں کو، غافلوں کو اور بے پرواؤں کو خدا کی طرف سے ڈھیل دی جاتی ہے تو اس کے اندر بھی حکمت ہے، اس پر بھی پورا یقین رکھیے۔ اگر آپ اس بنیادی حقیقت کو پیشِ نظر رکھیں گے تو یہ چیز ہمیشہ شیطان کے مقابلہ میں آپ کو پناہ میں رکھے گی، آپ ثابت قدم رہ سکیں گے۔ اور اگر اس سے غفلت ہوگئی تو شیطان آپ کو ٹھوکر کھلائے گا اور آپ کو دھوکہ دے گا، لہٰذا یہ بڑی بنیادی چیز ہے جو آپ کو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے۔

ہماری اصل حیثیت

دوسری ایک اور بات بھی میں آپ کے سامنے واضح کر دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ ہم اور آپ کو اس دنیا میں اپنا موقف اور مقام بھی طے کر لینا چاہیئے کہ ہم اس دنیا میں "کیا" ہیں؟ خالق ہیں؟ ظاہر ہے کہ خالق نہیں ہیں، مخلوق ہیں۔ مالک ہیں؟ ظاہر ہے کہ مالک نہیں ہیں مملوک ہیں۔ ہمارا صحیح موقف اور صحیح مقام جو قرآن مجید میں سورۂ حدید میں بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہم مُسْتَخْلَفٌ ہیں مُسْتَخْلِفٌ نہیں ہیں۔ مُسْتَخْلَفٌ کا مفہوم اگر آپ اُردو میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ ہم امین ہیں۔ ہمیں جتنی قوتیں، صلاحیتیں اور ذہنی و دماغی قابلیتیں اور جسمانی توانائیاں ملی ہیں، جو مال، دولت، اسباب، سامان، ذرائع اور وسائل ملے ہیں ہم ان سب کے امین ہیں، مالک نہیں۔ اور جب ہم امین ہیں تو ظاہر بات ہے کہ ہمیں ہر امانت کے لیے جواب دہی کرنی ہے۔ ایک ایک چیز کے متعلق حساب

دیتا ہے۔ امانت دینے والے نے جس حد تک اختیار دیا ہے بے شک اس اختیار کے دائرہ کے اندر ہم اختیار استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں، لیکن اس کے باہر رتی برابر بھی ہٹے تو اس کا حساب دینا ہوگا، جواب دہی کرنی ہوگی اور نتیجہ بھگتنا ہوگا اور کسی ایسے ویسے سے نہیں بلکہ اس ہستی کو بھگتنا ہوگا جو ذرّہ ذرّہ کا علم رکھتی ہے۔ پھر یا تو اس بات کا انکار کر دیجئے کہ آپ مُسْتَخْلَفْ نہیں ہیں بلکہ مالک ہیں۔ ورنہ اپنے سمع پر، اپنے فواد پر، اپنے بصر پر، اپنی ایک ایک چیز پہ پہرہ بٹھائیے۔ یہ آپ کی زبان کس کی ترجمان ہے یہ آپ کی عقل کی ترجمان ہے یا آپ کے بطن اور فرج کی ترجمان ہے؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت عقل کی ترجمان ہے۔ ہم نے اس کو بطن اور فرج کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ اگر موقع ہوتا تو میں تفصیل سے آپ کو بتاتا کہ ہماری شاعری ہمارا ادب اور ہمارا لٹریچر بالکل مہمل، گندی، ناپاک اور لغو چیز بن کر رہ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شمشیرِ جوہر دار جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی تھی۔ اس تلوار سے ہم نے گھانس کاٹنے کی درانتی کا کام لینا شروع کر دیا ہے۔

بہرحال اس بات کو ملحوظ رکھیے کہ ایک ایک چیز کے آپ مسئول ہیں، ذمہ دار ہیں۔ جو شخص اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر زندگی بسر کرتا ہے، اُس کے قدم جادۂ حق پہ استوار رہتے ہیں اور جہاں اس حقیقت سے غفلت ہوئی وہیں وہ فوراً مار کھا جاتا ہے۔ تو اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھیے۔ اس موقف کو، اپنے مقام کو، اپنے درجہ کو، اپنے مرتبہ کو کبھی بھی فراموش نہ کیجئے اور اگر اس کے انکار کی آپ میں ہمت ہے تو میں کسی ایسے دوست کا خیر مقدم کروں گا جو مجھ پر ثابت کر دے کہ اس کے انکار کی عقلی دلیل موجود ہے اور اس کی گنجائش ہے۔ کم از کم قرآن مجید میں، جس پہ آپ کا ایمان ہے، اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر یہ قرآن قبروں کے اوپر پڑھ کر صرف ایصالِ ثواب کے لیے ہے، تب تو میں کچھ نہیں کہتا۔ ان لوگوں کی قبروں پر بھی پڑھ کر اس کے ذریعہ ایصالِ ثواب کیجئے کہ جنھوں نے ساری عمر کبھی قرآن کو ہاتھ تک نہ لگایا ہو۔ لیکن اگر قرآن زندگی کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ہے جیسا

کہ فی الواقع وہ ہے، حق بتانے کے لیے ہے، صراطِ مستقیم پر گامزن رکھنے کے لیے ہے، مآل کار کا شعور دینے کے لیے ہے۔ تب میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کا مستقر، آپ کا مقام اور آپ کا موقف اس قرآن میں یہی بیان کیا گیا ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اس کے برعکس مجھے کوئی بات سمجھا سکیں تو میں ان کا خیر مقدم کروں گا۔ یہ بات بڑی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت تھی لیکن میں نے مختصراً عرض کیا ہے، چونکہ مجھ میں زیادہ بولنے کی طاقت نہیں ہے۔

ہر انسان محاذِ جنگ پر ہے

عزیزو! اب ایک حقیقت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کو آپ ہمیشہ پیشِ نظر رکھیئے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ہر ابنِ آدم اور بنت حوا اس دنیا میں محاذِ جنگ پر ہے، اور بڑے شاطر دشمن کے مقابلہ میں محاذِ جنگ پر ہے۔ بڑے کائیاں دشمن کے مقابلہ میں۔ جس نے خدا کو یہ چیلنج دے رکھا ہے کہ "اگر تو مجھے مہلت دے تو میں اس انسان کے داہنے سے، بائیں سے، آگے سے، پیچھے سے۔ اسکے آرٹ سے، ادب سے، لٹریچر سے، ثقافت سے، کلچر سے، غرض کہ ہر پہلو سے، اس کے اوپر تاخت کروں گا، اور اسے تیری صراطِ مستقیم سے ہٹا کر چھوڑوں گا۔ اس کو گمراہ کر کے رہونگا اور ثابت کر دوں گا کہ اس کو میرے اوپر کوئی فضیلت نہیں ہے۔" اللہ تعالےٰ نے اس شان کے ساتھ جو اسی کو زیبا ہے، جواب میں فرمایا کہ "جا تجھے مہلت دی گئی، جس کو تو بہکا سکتا ہے، بہکالے جو تیرے پیچھے لگ جائیں گے، میں ان سے اور تجھ سے، تیری ذریت سے، تیرے اولیاء سے جہنم کو بھر دوں گا۔" یہ قرآن مجید کی ایک واضح حقیقت ہے۔ قرآن حکیم میں قصہ آدمؑ و ابلیس صرف حکایت سنانے کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت بیان کرنے کے لئے ہے۔ اس کی بے شمار حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ آپ اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ آپ اس دُنیا میں ایک بڑے شاطر اور کائیاں دشمن کے مقابلہ میں محاذِ جنگ پر ہیں اور دشمن چالاک و مکار ہونے کے ساتھ طاقتور بھی ہے اس نے جس وقت

انسان کو گمراہ کرنے کا چیلنج کیا تھا اور مہلت مانگی تھی تو اس کے چیلے چانٹے گنتی کے ہوں گے، لیکن آج تو اس کی فوج بے شمار ہے۔ پھر اس کی فوج میں ایسے ایسے کائیاں لوگ پیدا ہو گئے ہیں کہ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ وہ آج خود ابلیس کے کان کتر سکتے ہیں۔ ابلیس کو بھی فلسفہ پڑھا سکتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ کائیاں ہیں۔ اب ابلیس کو خود کچھ کرنے کی خاص ضرورت نہیں ہے، اس سے زیادہ شاطر اس کے شاگرد ہیں۔ اگر تفصیل کا موقع ہوتا تو میں ان شاگردوں کے کرتوتوں کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے رکھتا اور آپ کو اپنی بات پوری طرح سمجھا دیتا۔ اجمالاً یوں سمجھ لیجئے کہ یہ شاگرد آج آرٹ کے نام سے، ادب کے نام سے، لٹریچر کے نام سے، ثقافت کے نام سے، کلچر کے نام سے، فیشن کے نام سے، تہذیب کے نام سے، پیٹ کے نام سے، سیکس کے نام سے، جمہوریت کے نام سے، عوام کے نام سے، خود اسلام کے نام سے اور نہ جانے کس کس نام سے خدا کی خلق کو گمراہ کر رہے ہیں اور ابلیس کے کان کتر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابلیس بھی شاید قیامت کے دن چیخ اٹھے گا کہ بے شک تم نے مجھے بھی مات دے دی۔ میں بھی تم سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا۔ پس اے بھائیو! ایسے چالاک دشمن اور اس کے ایسے لاؤ لشکر کے مقابلہ میں آپ محاذِ جنگ پر ہیں۔ جو سپاہی محاذِ جنگ پر ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ بدبخت ہے، بدقسمت ہے، نالائق ہے اگر وہ اناغفیل ہو کر اور گھوڑے بیچ کر سو جائے۔ گھوڑے بیچ کر سونے کا کیا موقعہ ہے؟ جن لوگوں کی صفت یہ تھی کہ وہ دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر باطل سے پنجہ آزمائی کرتے تھے اور اللہ کی کبریائی کی شہادت دینے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگاتے تھے اور پھر رات کو مصلّی پر اپنے آقا کے حضور کھڑے ہوتے تھے۔ اس سے مناجات کیا کرتے تھے۔ وہ آخر کا ہے کو جاگتے تھے؟ ان کو آخر کونسا غم تھا؟ بس ان کو اگر فکر تھی تو یہی کہ بڑے کائیاں دشمن سے مقابلہ ہے، بڑے شاطر دشمن سے سابقہ ہے جس کے ایجنٹ شیطانوں میں بھی ہیں۔ جنّوں میں بھی ہیں اور خود انسانوں میں بھی ہیں اور جیسا کہ میں عرض کر چکا آپ کو تو بڑے خطرہ کا سامنا ہے۔

اس زمانہ میں تو ابلیس کے بڑے ہوشیار، چالاک ایجنٹوں کا پورا کا پورا لاؤلشکر آپ کے داہنے بائیں، آگے اور پیچھے موجود ہے لہٰذا آپ کے لئے تو ازحد ضروری ہے کہ آپ کسی وقت غافل نہ ہوں۔ ہر وقت جاگتے رہیں، ہر وقت ہوشیار رہیں، چوکس اور چوکنے رہیں۔ محاذ جنگ پر جس طرح سپاہی سوتا ہے، اسی طرح سوئیں۔ جس طریقہ سے جاگتا ہے اسی طریقہ سے جاگیں۔ یہ اللہ کو معلوم ہے کہ اس مقابلہ میں بالآخر جیتے گا کون اور ہارے گا کون ؟ لیکن آدم کی ناخلف اولاد ہوگا وہ، جو اس حقیقت سے غافل ہو۔ یاد رکھیئے کہ اس کی یہ غفلت اس کو شیطان کے مقابلہ میں چاروں شانے چت کر دے گی۔

پس، میرے عزیزو! جاگتے رہو۔ آگاہ رہو۔ رات کو بھی، دن کو بھی، سوتے وقت بھی، جاگتے وقت بھی ہر وقت ہوشیار رہو۔ دائیں، بائیں، آگے پیچھے ہر سمت اور ہر طرف سے چوکنے رہو۔ اگر آپ اس حقیقت کو یاد رکھیں گے تو آپ صراط مستقیم پر گامزن رہیں گے۔ یہ بھی یاد رکھیئے کہ محاذِ جنگ پر ہر سپاہی کو ہتھیار کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور آپ کو بھی ہتھیار درکار ہے۔ یہ ہتھیار کیا ہے۔ ؟ تو جان لیجئے کہ اللہ تعالےٰ نے شیطان کے چیلنج کے جواب میں جو بات ارشاد فرمائی تھی، وہی ارشاد آپ کے لئے ہتھیار اور وہی چیز آپ کے لئے نسخۂ علاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ " جا میں انسانوں کی رہنمائی اور مدد کے لئے اپنی ہدایت اور اپنی کتاب نبیوں اور رسولوں کے واسطے سے نازل کرونگا۔ جو لوگ میری کتاب اور میرے انبیاء و رسل کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے رہیں، اُن کو تو ہرگز گمراہ نہیں کر سکے گا ہاں جو میری ہدایت کو چھوڑدیں گے تو اُن پر تیرا جادو بے شک چل جائیگا۔"

پس۔ شکر کیجئے کہ شیطان کے مقابلہ میں آپ کے پاس اللہ کی آخری کتاب بکمال و تمام موجود ہے اس کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیئے۔ اس کو ایصالِ ثواب کا نسخہ نہ سمجھ لیجئے بلکہ اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اس کے اوامر و نواہی کو معلوم کیجئے۔ اس کے احکام اور ان کی حکمتوں کو جاننے کی سعی کیجئے۔ اس کی

دعوت کا شعور حاصل کیجئے۔ بُرے اعمال، نافرمانی، سرکشی، طغیان و بغاوت کے ہولناک انجام سے آگاہی حاصل کیجئے اور ساتھ ہی ساتھ جو کچھ علم حاصل ہوتا رہے اس پر عمل کی جدوجہد شروع کیجئے اور دوسروں تک قرآن کی دعوت کو نہایت دلسوزی کے ساتھ پہنچانے کی فکر کیجئے۔ اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیجئے۔ اس کا حق اسی طرح ادا ہوگا۔ اس کو مضبوطی سے تھام لینے کا یہی مطلب اور مفہوم ہے۔ اس کے برعکس طرزِ عمل اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق ہے اس کی محبت کا دعوےٰ لاف زنی ہے، بے وزن ہے، بے حقیقت ہے جس کا پتہ آخرکار روزِ حساب چل جائے گا۔

ہماری حالت کی مثال

عزیزو! اب صرف ایک حقیقت کی اور یاد دلانا چاہتا ہوں اور وہ محض میرا تأثر نہیں ہے بلکہ میرے نزدیک ایک زندہ حقیقت ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری پوری قوم کے اوپر اس وقت اُس قسم کے حالات پیش آرہے ہیں جس قسم کے منذرات، تنبیہات اور جس قسم کے تازیانے بنی اسرائیل پر ہوئے تھے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس دنیا میں دعوت الی اللہ کی وراثت بنی اسرائیل سے چھین کر آپ کو دی گئی تھی۔ سورۂ مائدہ آپ نے پڑھی ہوگی، پھر پڑھ لیجئے۔ اس میں اللہ تعالےٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ "میں بنی اسرائیل سے ان کی نافرمانی، کج روی اور خیانت کی وجہ سے یہ امانت چھین کر اب تمہارے حوالے کرتا ہوں لیکن اگر تم نے مجھ سے نقضِ عہد کیا۔ میری کتاب کو چھوڑا۔ میرے نبی سے منہ موڑا، میری شریعت کے ساتھ بغاوت کی، میرے ساتھ مکاری اور چالاکی کی تو تمہارے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوگا جو بنی اسرائیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔" میرا تاریخ کا جو مطالعہ ہے اور تاریخ سے میری مراد وہ تاریخ ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے اور کسی تاریخ کا میں عالم نہیں ہوں۔ اس مطالعہ کی روشنی میں مَیں کہہ سکتا ہوں کہ اس قوم پر اُسی طرح کے حالات پیش آرہے ہیں، جس قسم کے حالات بنی اسرائیل کو پیش آئے تھے۔ یہ

بڑا نازک وقت ہے۔ میرے عزیزو! کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو۔ اس طرح کے واقعات، حالات اور حادثات چند خاص اشخاص و افراد کی غلطیوں کا نتیجہ نہیں ہوتے اور نہ ہی چند خاص اشخاص و افراد کی غلطیوں کے ایسے بھیانک نتائج نکلتے ہیں۔ بلکہ یہ صورتِ حال پوری کی پوری قوم کے شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بڑے ہی ناداں ہیں، وہ لوگ جو چند اشخاص و افراد کو موردِ الزام گردان کر سارا زور بس ان کو مجرم ثابت کرنے پر لگا رہے ہیں۔ گویا باقی سب خیر سلّا ہے۔ حالانکہ یہ نذرات یہ تنبیہات، یہ حادثات، یہ واقعات پوری قوم کی نافرمانی، سرکشی اور کرتوت کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں۔ ذرا غور تو کرو کہ ایک ہزار سال بعد ہم نے ہندو قوم کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے وہ بھی ایک عورت کے آگے۔ تقریباً ایک لاکھ اپنے لوگ بطور قیدی پکڑوا دیئے، آدھے سے زیادہ ہمارا ملک ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ معمولی واقعات نہیں ہیں۔ بھائیوں کے ہاتھوں جس طریقہ سے بھائیوں کا خون خچر ہوا ہے۔ عزتیں پائمال ہوئی ہیں۔ اعوذ باللہ میں سچ کہتا ہوں کہ جو بھیانک واقعات اخبارات میں آئے ہیں اگر انکا پانچ فیصد بھی صحیح ہے تو کلیجہ شق کر دینے کو کافی ہے لیکن ذرا غور کرو کہ ان کا کتنا تاثر ہماری قوم نے لیا ہے۔ اس وقت اس بچے کھچے ملک کے حصّہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اللہ اکبر! بھائی، بھائی کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ زبان کی بنیاد پر، نسل کی بنیاد پر، کلچر کی بنیاد پر، علاقہ کی بنیاد پر جو اُمّتِ محمدؐ، کلمہ لا الٰہ الا اللہ، محمد رسول اللہ پر جمع کی گئی تھی۔ جس کا کلمہ ایک، کتاب ایک، رسول ایک، قبلہ ایک، آج وہ کس طرح شیطان کے نرغہ میں پھنسی ہوئی ہے۔ بھائیو! میں پھر کہتا ہوں کہ یہ بڑا نازک وقت ہے، یہ اصلاحِ حال کا وقت ہے، یہ جوڑنے اور ملانے کا وقت ہے۔ یہ نفرت دلانے اور ایک دوسرے پر الزام لگانے کا وقت نہیں۔ اس سے آخر قوم کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ ہم کسی ایک طبقے یا گروہ کو ملزم قرار دیں اور ان کو مجرم ثابت کریں کہ ساری خرابیوں کا باعث تم ہو اور وہ ہم پر الزام لگائیں اور ہمیں مجرم ثابت کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم سب کے سب مجرم ہیں،

پوری کی پوری قوم مجرم ہے، ہم سب اللہ کے نافرمان ہیں۔ پس ہم سب کو اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، اس سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنی چاہیئے، اس کی جناب میں ہم سب کو توبہ اور استغفار کرنا چاہیئے۔ ہم سب کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیئے اگر ایسا نہ کیا گیا اور جسکے دور دور بھی آثار نہیں ہیں تو جان لینا چاہیئے کہ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی کشتی بالکل بھنور میں ہے، گرداب میں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ڈوبی، تب ڈوبی۔ معلوم نہیں کہ آپ لوگوں کو بھی یہ حقیقت نظر آتی ہے یا نہیں، مجھے تورات کے اندھیارے اور دن کے اجالے میں بصارت سے بھی اور بصیرت سے بھی یہی حقیقت نظر آتی ہے۔

توبہ کی منادی

عزیزو! آج وقت ہے کہ یوحنا مسیح کی طرح سے آپ کے اندر سے وہ لوگ اٹھیں جو پوری قوم میں توبہ کی منادی کریں، استغفار کی منادی کریں۔ اللہ سے اپنے تعلق کو استوار کرنے کی منادی کریں، نبی سے اپنی نسبت کے حقیقی تعلق جوڑنے کی منادی کریں۔ خلاف دین، خلاف اسلام کاموں سے اجتناب کی منادی کریں۔ سرکشی نافرمانی سے بچنے کی منادی کریں، حلال وحرام کی تمیز کی منادی کریں، اس وقت ان کاموں کے سوا دوسرے کام بالکل فضول ہیں۔ شاطر اسی طرح لڑتے رہیں گے اور ایک سے ایک بڑا عذاب مختلف شکلوں میں آتا رہے گا۔ ایسے بگڑے ہوئے معاشرہ میں جو شخص وافراد مسلط ہونگے وہ بھی اللہ کے قہر کی نشانیاں ہونگے۔ کسی کے اندر خیر نہیں ہے۔ ایک پارٹی اگر جائیگی تو جس طریقہ سے شر، فساد کے ساتھ آئی ہے ـــــــــــ کوئی دوسری پارٹی بھی اسی طرح کے شر اور فساد کے ساتھ ممکن ہے مسلط ہو جائے۔ لیکن اس وقت محض ہاتھوں کے بدلنے میں بھلائی نہیں ہے۔ ملک کے لئے کوئی خیر نہیں ہے، ملک کی بھلائی اگر ہوگی تو ان ہی بے غرض لوگوں کے ہاتھوں ہوگی جو آج یوحنا مسیح کی طرح توبہ کی منادی کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، جو صاف صاف، بالکل حق، واضح طور پر بڑوں کے سامنے، چھوٹوں کے سامنے، ـــــــــ پوری قوم کے سامنے

وہی بات پیش کریں جو حق ہے۔ جو دین کا تقاضہ ہے۔ لیکن جان رکھو کہ یہ راستہ آسان نہیں ہے، بہت کٹھن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس راہ میں تمہارے سر کاٹ کر ظالم لوگ اپنی معشوقاؤں کے سامنے تحفہ کے طور پر پیش کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اس راہ میں تمہیں سولی پر چڑھنا پڑے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے وطن سے نکال دیئے جاؤ۔ معلوم نہیں کہ اس راہ میں کیا کیا پیش آئے گا۔ بدر و اُحد۔ خندق و حنین، اس راہ کی لازمی منازل ہیں۔ مستقبل کا علم صرف اللہ کو ہے۔ لیکن جو کچھ ہو گا اسی کے اندر تمہارے لئے خیر اور اسی کے اندر فوز و فلاح ہے۔ اس بات پر یقین رکھو۔ قرآن کی دعوت اور توبہ کی منادی کا کام لے کر اٹھ کھڑے ہو جاؤ شاید اللہ تعالےٰ تمہاری اس سرفروشانہ ادا کو پسند فرمالے اور تمہاری قوم کو بچالے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ قوم کی کشتی بھنور میں ہے۔

آخر میں، میں اپنے لئے اور آپ کے لئے، دونوں کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ہم کو حق کی معرفت عطا فرمائے اور حق پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ!

انبیاء کرام کے طریق دعوت اور نہج انقلاب کے موضوع پر

مولانا امین احسن اصلاحی کی دو اہم تصانیف

۱۔ **دعوتِ دین اور اس کا طریق کار**

صفحات ۲۱۲، مضبوط جلد اور خوشنما ڈسٹ کور کے ساتھ۔ قیمت فی نسخہ ۱۰/-

۲۔ **اقامتِ دین کے لئے انبیاء کرام کا طریق کار**

صفحات ۲۸، خوشنما کور کے ساتھ۔ قیمت فی نسخہ ۲۵/ ۱

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

مولٰنا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ کی تفسیر 'تدبرِ قرآن' کے ضمن میں

ایک اہم وضاحت

'تدبرِ قرآن' کی جلد اوّل کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت کا جب مرحلہ آیا تو اس خیال کے تحت کہ بڑھتے ہوئے اخراجاتِ طباعت کے پیشِ نظر بہتر ہے کہ جلدوں کی ضخامت کسی قدر کم کی جائے تاکہ خریداروں پر ایک دم زیادہ بار نہ پڑے۔ اشاعتِ دوم کے ۵۰۰ نسخے تو سابقہ حساب سے یعنی تفسیر سورۂ آلِ عمران سمیت طبع کرا لیے گئے اور ۵۰۰ نسخے صرف سورۂ بقرہ تک طبع کرائے گئے تاکہ آئندہ ہر جلد ۶۰۰ تا ۶۵۰ صفحات پر مشتمل ہو۔ لیکن یہ چیز مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے پسند نہیں فرمائی۔ لہٰذا اب جلد اوّل حسبِ سابق طبع کرائی جا رہی ہے اور اِن شاء اللہ جلد دستیاب ہو جائے گی۔ اِدھر جلد دوم کا پہلا ایڈیشن بھی ختم ہو رہا ہے۔ گویا سرِدست ہمارے پاس جلد سوم اور جلد چہارم موجود ہیں۔ جلد اوّل اور جلد دوم زیرِ طبع ہیں اور جلد پنجم کی کتابت شروع کرا دی گئی ہے۔

اس طرح سلسلۂ تدبرِ قرآن کی موجودہ صورتِ حال یہ ہے :

۱۔ مبادیٔ تدبرِ قرآن — ۸/-
۲۔ تدبرِ قرآن : مقدمہ و تفسیر آیۂ بسم اللہ و سورۂ فاتحہ — ۳/-
۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃 و سورۂ بقرہ — ۴۰/-
۴۔ 〃 جلد اوّل از ابتدا تا سورۂ آلِ عمران (زیرِ طبع)
۵۔ 〃 جلد دوم از سورۂ نساء تا سورۂ اعراف (زیرِ طبع)
۶۔ 〃 جلد سوم از سورۂ انفال تا سورۂ بنی اسرائیل — ۵۰/-
۷۔ 〃 جلد چہارم از سورۂ کہف تا سورۂ قصص — ۵۰/-
۸۔ 〃 جلد پنجم از سورۂ عنکبوت تا ؟ (زیرِ کتابت)

المعلن : ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا

رمضان مبارک کا بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

جس میں

قرآن مجید کے وہ ۵ حقوق جو ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد عائد ہوتے ہیں

یعنی

- ۱ — ایمان و تعظیم
- ۲ — تلاوت و ترتیل
- ۳ — تذکر و تدبر
- ۴ — حکم و اقامت
- ۵ — تبلیغ و تبیین

کسی قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں

۱۸×۲۱/۸ سائز پر ۸۰ صفحات : سفید کاغذ، آفسٹ کی طباعت خوشنما کور

قیمت فی نسخہ — دو روپے

خود پڑھیے اور

رمضان مبارک اور عید سعید کے تحفے کے طور پر دوستوں کو پیش کیجیے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۲ - افغانی روڈ - سمن آباد - لاہور

نشری تقاریر

اسرار احمد

ارشادِ باری تعالیٰ

۱۔ سورۂ انعام رکوع ۳

(ایک تقریر جو ۲۳۔ اپریل ۱۹۷۶ء کی شام کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی گئی)

أعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۂ انعام قرآنِ حکیم کی طویل ترین مکّی سورتوں میں سے ہے اور داخلی و خارجی دونوں قسم کے قرائن و شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر آپؐ کے قیامِ مکّہ کے بالکل آخری دَور میں پُوری کی پُوری یکبارگی نازل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ایکؔ جانب تو فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ زورِ استدلال اور جوشِ خطابت دونوں اپنے عُروج پر ہیں اور دوسؔری جانب وہ بحث و تمحیص اور ردّ و قدح بھی پُوری شدّت کو پہنچی نظر آتی ہے جو آنحضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی دعوت کے ردِّ عمل کے طور پر مکّہ میں پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہ سورت از اوّل تا آخر مشرکین، منکرینِ آخرت اور مکذّبینِ نبوّت و رسالت کے ساتھ ایک مسلسل مناظرے و مجادلے پر مشتمل ہے۔

ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کے بنیادی نکات تین تھے:

ایکؔ: اللہ تعالیٰ کی کامل اور بے لاگ توحید کا اقرار و اعلان اور شرک کی ہر صورت کا پُرزور ابطال خواہ وہ کسی کو کسی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا ہم جنس اور ہم کفو قرار دینے کی صورت میں ہو، خواہ اس کی کسی صفت میں اُس کا ہمسر یا ہم پلّہ بنا دینے کی صورت میں یا کسی کو کسی پہلو سے اس کے حقوق و اختیارات میں اُس کا ساجھی یا مدِّ مقابل یا ضدّ و ندّ ٹھہرانے کی صورت میں ہو۔

دوسرے ایمان بالمعاد ـــــ یعنی بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب کتاب، جزاء و سزا اور جنّت اور دوزخ کی حقانیّت کا اقرار و یقین ـــــ اور

تیسرے ایمان بالرّسالت ـــــ یعنی انزالِ وحی و کتب اور بعثتِ انبیاؑ و رُسُل کا اقرار، تمام انبیاء و رُسُل کی تصدیق اور بالخصوص آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت و رسالت کا اقرار و یقین۔

قرآنِ حکیم کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ کتابِ الٰہی کی مکّی سورتوں میں انہی تین اصلی اُمور کا اثبات اور ان پر وارد کئے جانے والے اعتراضات کا پُرزور ابطال تانے بانے کے مانند بُنا ہوا ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ ع "اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!" کے مصداق کہیں ان کا کوئی ایک پہلو زیرِ بحث آگیا ہے کہیں دوسرا، اور کہیں کوئی اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہیں کوئی، کہیں زیادہ زور (یعنی EMPHASIS) ایمان باللہ یا توحید پر ہے کہیں ایمان بالآخرت یا معاد پر اور کہیں بحث اِدھر سے اُدھر کو چلتی ہے کہیں اُدھر سے اِدھر کو! ـــــ سورۂ انعام میں یہ کیفیّت اس حد تک نمایاں ہے کہ اس کے ہر رکوع میں ان تینوں مضامین کا تانا بانا صاف پہچانا جا سکتا ہے:

مثلاً اس کے تیسرے رکوع ہی کو لیجئے ـــــ اس میں کل دس آیات ہیں جن میں سے پہلی چار آیات ردِّ شرک پر مشتمل ہیں، درمیانی دو ردّ منکرینِ نبوّتِ محمّدیؐ پر اور آخری چار ردِّ منکرینِ آخرت پر۔

ارشاد ہوتا ہے "وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝" (یعنی اُس سے بڑھ کر ظالم اور ناانصاف کون ہوگا جو اللہ پر بہتان تراشے یا اُس کی نشانیوں کو جھٹلائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے ظالم کبھی فلاح سے ہم کنار نہ ہو سکیں گے) گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی حیثیّت سے کسی کو شریک کرنا دوہرا جرم ہے ـــــ اس لیے کہ ایک طرف تو یہ اللہ تعالیٰ پر صریح افتراء اور بہتان تراشی ہے اور دوسری طرف ان تمام آفاقی، انفسی اور تنزیلی آیات کی تکذیب ہے جو گویا پکار پکار

کر توحیدِ خالص کی شہادت دے رہی ہیں۔

آگے فرمایا: "وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ۝ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ۝ انْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝" (یعنی یاد کرو وہ دن جب ہم جمع کریں گے ان سب کو، پھر پوچھیں گے مشرکوں سے کہاں ہیں تمھارے وہ شرکاء جنھیں تم نے ہمارا سا بھی سمجھا تھا، اس وقت ان کی ساری فتنہ پردازی دھری رہ جائے گی اور ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہ جائے گا کہ قسم کھا کر کہیں کہ ہمیں اللہ ربُّ العزّت کی قسم ہے ہم ہرگز مشرک نہ تھے۔ دیکھا تم نے کیسا جھوٹ تراشا انہوں نے اپنے آپ پر اور ہوا ہو گیا اُن کا سارا افتراء۔)

ان آیات میں کھلے کھلے مشرکین کے کھسیانے پن کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ تو واضح ہے ہی ان بر خود غلط لوگوں کے فریب کا پردہ بھی چاک کر دیا گیا ہے۔ جو دعویٰ تو توحید کا کرتے ہیں لیکن ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

کے مصداق شرک سے بالکلیہ بری ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں اور "وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ۝" کی کامل تصویر بنے ہوئے ہیں۔ اس کی نمایاں ترین مثال تو عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث ہے کہ اس دُنیا میں بھی جب اُن کے شرک کا پردہ دلائل سے چاک کر دیا جاتا ہے تو اُن کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ اپنی تثلیث کو بھی توحید ہی کا رنگ دیں اور ایک میں تین اور تین میں ایک کے لایعقل معمّے کے دامن میں پناہ لیں ——— ویسے اس کی بہت سی دوسری مثالیں بھی ہمارے گرد و پیش موجود ہیں فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ!

حاصلِ کلام یہ کہ اِن مشرکین کے حصّے میں تمام تر جھوٹ اور افتراء ہی آیا ہے اس دنیا میں یہ خُدا پر افتراء کرتے ہیں۔ آخرت میں خود اپنے آپ پر جھوٹ تراشیں گے!

اِس کے بعد کی دو آیات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین و معاندین کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ " وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْــَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ " (یعنی ان میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو (اے نبیؐ) آپ کی بات (بظاہر) کان لگا کر سنتے ہیں لیکن ہم نے (ان کے اعراض و انکار، بغض و عناد اور تعصب اور ہٹ دھرمی کے باعث) ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ سمجھ نہ سکیں اور اُن کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے تاکہ سُن نہ سکیں۔ چنانچہ اب وہ خواہ تمام نشانیاں دیکھ لیں، ہرگز ایمان نہ لائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں جھگڑا کرتے ہوئے تو وہ لوگ جو کفر پر جم چکے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ سب اگلوں کی کہانیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور وہ دوسروں کو بھی روکتے ہیں اس سے اور خود بھی محروم رہتے ہیں اس سے، اور وہ نہیں برباد کر رہے مگر صرف اپنے آپ کو لیکن انہیں اس کا شعور حاصل نہیں!")

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے قانونِ ہدایت و ضلالت کی زد میں آئے ہوئے شامت زدہ لوگوں کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔ کہ وہ اپنی ضد یا تعصب یا اپنے مفادات اور مصلحتوں کے باعث اندھے، بہرے ہو چکے ہوتے ہیں اور نہ کوئی عقلی و برہانی دلیل اُن کی آنکھیں کھول سکتی ہے نہ کوئی حسّی و ظاہری معجزہ ـــــ بایں ہمہ وہ عوام الناس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی غرض سے یہ سوانگ رچاتے ہیں کہ بن بن کر حضورؐ کے پاس آتے ہیں اور بظاہر کان لگا کر آپ کی بات سنتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہوئے اٹھتے ہیں کہ آپؐ نے کوئی نئی بات تو نہیں کہی، یہ تو سب اگلوں کی فرسودہ باتیں ہیں تاکہ عوام کو باور کرا سکیں کہ انہوں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو علیٰ وجہ البصیرت رد کیا ہے ـــــ نہ کہ محض ہٹ دھرمی سے۔ آخر میں فرمایا کہ دنیا میں عارضی طور پر اُن کی چال کارگر ہو جائے تب بھی حقیقت میں تو

یہ اپنے لیے ہلاکت اور بربادی ہی کا سامان جمع کر رہے ہیں ـــــ کاش کہ انہیں اس کا شعور ہوتا۔

آخری چار آیات میں آخرت کے دو قسم کے منکرین کے انجام کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ایک وہ جو دنیا کی محبت کے باعث آخرت کی جانب سے آنکھیں تو بند کئے رہتے ہیں لیکن ان کے دل کو یہ دھڑکا بھی لگا رہتا ہے کہ مبادا حساب و کتاب اور جزا سزا کی گھڑی آ ہی جائے، اور دوسرے وہ جو دھڑلے کے ساتھ آخرت کا صاف صاف انکار کرتے ہیں۔

پہلی قسم کے لوگوں کے بارے میں فرمایا: "وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝" (یعنی کاش تم دیکھ پاتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کئے جائیں گے تو کہیں گے کاش ہمیں پھر دنیا میں بھیج دیا جائے تو ہم اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کریں بلکہ مومنوں میں شامل ہو جائیں۔ حالانکہ اس وقت اُن پر کھلے گا وہی کچھ جس کو وہ پہلے چھپائے پھرتے تھے اور اگر اُن کو لوٹا دیا جائے تب بھی وہ وہی کریں گے جس سے روکے گئے تھے اور ان کا یہ سارا واویلا سراسر کذب پر مبنی ہوگا۔) گویا اس قسم کے لوگوں کا اصل مرض قوتِ ارادی کی کمزوری اور حبِّ دُنیا سے مغلوبی ہوتا ہے۔ اس وقت بھی وہ آخرت سے صرف اسی وجہ سے غافل ہیں ورنہ ان کی فطرت میں تو آخرت کا اقرار مضمر ہے جسے وہ جان بوجھ کر دباتے اور چھپاتے ہیں۔ قیامت کے روز جب وہ حقیقت جس کو انہوں نے شعوری طور پر دبا رکھا تھا کھل کر سامنے آئے گی تو وہ واویلا کریں گے کہ اگر ہمیں ایک اور موقع دیا جائے اور دنیا میں واپس بھیج دیا جائے تو ہم یکسر نکمی اور آخرت طلبی کی راہ اختیار کر لیں گے۔ حالانکہ بالفرض ایسا ہو جائے تو بھی وہ دوبارہ اپنی خواہشاتِ نفس سے مغلوب ہو کر یہی کچھ کریں گے جو اب کر رہے ہیں۔

اور دوسری قسم کے لوگوں کے بارے میں فرمایا: "وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا

بِالْحَقِّ ط قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ط قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝
(یعنی وہ کہتے ہیں نہیں ہے ہماری زندگی مگر بس یہی دنیا کی ——— اور ہمیں ہرگز دوبارہ اٹھایا نہ جائے گا اور کاش تم دیکھتے جب وہ کھڑے کئے جائیں گے اپنے رب کے سامنے اور وہ پوچھے گا کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟ تو وہ کہیں گے، کیوں نہیں، اے ہمارے رب! تو رب کہے گا پس چکھو مزا عذاب کا بہ سبب اُس کُفر کے جو تم کرتے رہے! ——— گویا اس وقت منکرین آخرت کے تکبّر و غرور اور اعراض و انکار کا پردہ چاک ہو جائے گا ——— اور اُن کی شامتِ اعمال حقیقت بن کر سامنے آجائے گی۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۲۔ سُورۂ انعام رکوع ۹

(ایک تقریر جو ۴ جون ۷۶ء کی شام کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی گئی)

سورۂ انعام کے بارے میں پہلے ایک موقع پر یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس میں از اوّل تا آخر مشرکین اور منکرین آخرت و نبوّت کے ساتھ ایک مسلسل مجادلے کا رنگ ہے۔ اس کا نواں رکوع جو تعدادِ آیات کے اعتبار سے بھی تقریباً وسط میں ہے، اپنے مضامین کی جامعیّت کے اعتبار سے گویا اس پوری سورت کے عمود کی حیثیّت رکھتا ہے۔

اس رکوع میں پہلے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبان مبارک سے مشرکین سے دوٹوک الفاظ میں اعلان براءت کرایا گیا جس میں ان کی گمراہی و ضلالت پر تمثیل کے انتہائی بلیغ و فصیح پیرائے میں شدید تنقید بھی ہے اور اپنے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا پورے جوش اور ولولے کے ساتھ اقرار و اعلان بھی ——— فرمایا گیا:

"کہہ دو کہ کیا ہم بھی اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پکارنے لگیں جو ہمیں نہ تو کوئی نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان، گویا ہم اللہ سے ہدایت پا جانے کے بعد دوبارہ گمراہی کی

طرف لوٹ جائیں، اور اس شخص کی مانند بن جائیں جسے شیطانوں نے بیابان میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و سرگرداں پھر رہا ہو درآں حالیکہ اس کے ساتھی اُسے پکار رہے ہوں کہ ہماری طرف آؤ، یہ سیدھی راہ موجود ہے ——— (اے نبی! ڈنکے کی چوٹ) کہہ دو کہ ہدایت تو بس اللہ ہی کی ہدایت ہے اور ہمیں تو حکم ملا ہے کہ ہم اپنے آپ کو مالکِ کائنات کے حوالے کر دیں، اور (اُسی کا حکم ہے کہ) نماز قائم کرو اور اس سے ڈرتے رہو۔ اسی کے حضور تم سب جمع کیے جاؤ گے ——— اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا، اور جس دن اس کا حکم ہوگا کہ (بعث بعد الموت اور حشر و نشر) ہو جائے تو وہ ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس کا امر شدنی ہے۔ اور جس روز صور پھونکا جائے گا اُس روز کامل اختیار اُسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ غائب و حاضر سب کا علم رکھنے والا ہے اور حکیم بھی ہے اور خبیر بھی!"

اس کے بعد بطورِ مثال اس مجادلے اور محاجّے کا ذکر کیا گیا ہے جو ابوالانبیاء، امام النّاس، حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبیّنا وعلیہ الصّلوٰۃ والسّلام اور ان کے والد اور پوری قوم کے مابین ہوا، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے نہایت حکیمانہ انداز میں درجہ بدرجہ استدلال کے ساتھ کواکب پرستی کا ردّ کرتے ہوئے انہیں توحیدِ خالص کے اُس مقام تک لا پہنچایا جس کی ہدایت اللہ نے انہیں عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ماحول سے سراسر بے نیاز اور اِس راہ کے مصائب و مشکلات سے قطعاً بے پرواہ ہو کر اس ظلمت کدۂ شرک میں توحید کا نعرۂ مستانہ بلند کر دیا: فرمایا:

"اور یاد کرو جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آذر سے کہا کیا آپ بتوں کو معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ مجھے تو آپ اور آپ کی پوری قوم کھلی گمراہی میں نظر آ رہی ہے۔ اور اسی طرح ہم نے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کی خدائی بادشاہی کے حقائق کا مشاہدہ کراتے رہے تھے تاکہ (وہ دوسروں پر بھی حجّت قائم کر سکے) اور خود بھی کاملینِ یقین میں سے ہو جائے۔ چنانچہ جب رات طاری ہوئی اور اُس نے ایک تارا دیکھا تو وہ بولا "یہ ہے میرا رب!" اور جب وہ تارا ڈوب گیا تو اُس نے کہا "میں ڈوب جانے والوں کو پسند

و مطلوب نہیں بنا سکتا۔" پھر جب اُس نے چاند کو چمکتے دیکھا تو کہا "یہ ہے میرا رب!" اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس نے کہا "اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں تو گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا!" پھر جب اُس نے سُورج کو ضَوفشانی کرتے دیکھا تو کہا "یہ ہے میرا رب! یہ سب سے بڑا ہے!" پھر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو اُس نے کہا "اے میری قوم! میں تو ان سب سے بری ہوں جنھیں تم نے خدائے واحد کے ساتھ شریک ٹھہرا رکھا ہے۔ میں نے تو اپنا رُخ ہر جانب سے یکسو ہو کر اس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا ——— اور (سن رکھو کہ) میں ہرگز مشرکوں میں سے نہیں ہوں!"

قوم حضرت ابراہیمؑ کے اس طرزِ استدلال کے آگے تو لاجواب ہو کر رہ گئی لیکن جیسا کہ دلیل کے میدان میں مات کھا جانے والے ہٹ دھرم لوگوں کا دستور ہے اُس نے اِدھر اُدھر کی کج بحثی اور کٹ حجتی بھی شروع کر دی اور حضرت ابراہیمؑ کو دھمکانا بھی شروع کر دیا کہ اگر تم نے ہمارے مزعومہ معبودوں کا انکار کیا تو تم پر اُن کی پھٹکار اور لعنت پڑ کر رہے گی اور تم کہیں کے نہ رہو گے۔ اُن کی اس تخویف و تحذیر کا جواب اس مردِ موحّد (علیہ الصّلوٰۃ والسّلام) نے ؎

"آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی"

کے مصداق جس بے باکی سے دیا اُسے قرآنِ حکیم ہی کے الفاظ میں سُنیئے!

"اور اُس کی قوم اُس سے جھگڑنے لگی تو اُس نے کہا "کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو، درآں حالیکہ وہ مجھے ہدایت فرما چکا ہے اور (اچھی طرح سن رکھو) میں ہرگز نہیں ڈرتا اُن سے جنھیں تم نے اُس کے ساتھ شریک سمجھ رکھا ہے الّا آنکہ میرا رب ہی کچھ چاہے۔ میرے رب کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ کیا تمھیں دھیان نہیں آتا! ——— اور آخر میں تمہارے مزعومہ شرکاء سے کیوں ڈروں جب کہ تمہیں خوف نہیں آتا کہ تم نے اللہ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرا لیا ہے جن کے لیے اس نے کوئی سند نازل

نہیں فرماتی ـــــ پھر اگر تم سوجھ بوجھ سے بالکل عاری نہیں ہوگئے ہو (تو خود غور کرو کہ ہم) دو فریقوں میں سے بے خوفی کا زیادہ مستحق کون ہے (کان کھول کر سن لو) جو لوگ ایمان لائے اِس شان کے ساتھ کہ انہوں نے اپنے ایمان میں کوئی آمیزش اور آلودگی (شرک کی) باقی نہ رہنے دی تو اطمینان اور بے خوفی بھی انہی کا حصّہ ہے اور ہدایت و راہ یابی بھی"

گویا اس طرح ایک طرف تو مشرکینِ مکّہ کے سامنے ایک بار پھر انہی کے جدِّ امجد کے حوالے سے دعوتِ توحید پورے شرح و بسط کے ساتھ آگئی اور اُن پر واضح کر دیا گیا کہ آج پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے چنانچہ اب ہمارے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم ٹھیک اسی مقام پر ہیں جہاں آج سے اڑھائی ہزار سال قبل تمہارے اور ان کے جدِّ امجد حضرت ابراہیم علیہ السّلام تھے۔ اور تمہاری بدبختی کہ تم نے ٹھیک وہی روش اختیار کر لی ہے جو ابراہیمؑ کی قوم نے اختیار کی تھی اور دوسری طرف ایمان کی اصل حقیقت پر سے پردہ اُٹھا دیا گیا کہ جب انسان ہر جانب سے یکسو ہو کر خدائے واحد و قہّار پر ایمان لے آتا ہے تو اُس کے دل سے ماسوا کا خوف بالکل زائل ہو جاتا ہے اور وہ اُس ولایتِ خداوندی سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ جس کا اصل ثمرہ رنج و غم اور خوف و ہراس کی تمام صورتوں سے مکمّل رُستگاری ہے، بفحوائے آیتِ قرآنی: اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

اِن آیاتِ مبارکہ کے بارے میں بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ شاید ان میں خود حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ذہنی ارتقاء کے مختلف مدارج کی رُوداد بیان ہوئی ہے۔ گویا اُن کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ خود بھی شرک سے تدریجاً توحید تک پہنچے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام ابتدا ہی سے فطرتِ سلیمہ سے بتمام و کمال بہرہ ور ہوتے ہیں اور کسی نبی پر کوئی ایک دن بھی حالتِ شرک میں نہیں گذرا۔ وہ اوّل روز ہی سے مُوحّدِ کامل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اِن آیات میں حضرت ابراھیم علیہ السّلام کا اپنی قوم سے مُحاجّہ و مجادلہ بیان ہوا ہے۔ جس میں حضرت ابراہیمؑ ایک

لطیف استدراجی طرزِ استدلال سے اپنی قوم پر حجّت قائم کرتے چلے گئے اور رفتہ رفتہ انہیں اس مقام پر لے آئے جہاں توحیدِ خالص کا کامل انکشاف اُن کے قلوب و اذہان پر ہوگیا۔ اس پر شاہدِ عادل ہیں اگلے رکوع کی پہلی آیت کے الفاظ: وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ یعنی "یہ تھی ہماری وہ حجّت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اُس کی قوم کے مقابلے میں عطا فرمائی۔ ہم جسے چاہتے ہیں درجے پر درجے عطا کرتے چلے جاتے ہیں یقیناً تمہارا رب حکیم بھی ہے اور علیم بھی" ——

یہ دوسری بات ہے کہ قوم پر اِس کے باوجود عصبیّتِ جاہلیّت غالب آگئی، اور اُس نے کج بحثی شروع کردی۔ چنانچہ جیسا کہ ایک داعیٔ حق کا طریقہ ہونا چاہیئے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے نہایت باوقار لیکن دوٹوک الفاظ میں توحیدِ خالص کا اعلان کرکے قوم سے علیحدگی اختیار کرلی۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

۳۔ سُورۂ انعام رکوع ۱۳

(ایک تقریر جو ۲۔ جولائی ۷۶ء کی شام کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی گئی)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى: وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

سُورۂ انعام کے مجموعی مزاج کے مطابق اس کے تیرھویں رُکوع کے آغاز میں بھی تین آیات میں توحیدِ باری تعالیٰ کا بیان بڑے پُرشکوہ انداز میں ہوا ہے اور ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں بعض نہایت اہم نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بقیہ سات آیات میں نبوّت و رسالت اور مَعاد و آخرت کا تذکرہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ انسانوں کی ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ کے قانون کی بھی بعض اہم دفعات بیان ہوئی ہیں اور لوگوں کی سعادت و شقاوت کے ذیل میں بھی بعض نہایت لطیف حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے چنانچہ پہلی تین آیات میں فرمایا گیا :۔

"وہ آسمانوں اور زمین کو نیست سے ہست کرنے والا ہے۔ اُس کے اولاد کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اُس کے کوئی بیوی ہی نہیں۔ ہر چیز اُس نے پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے، یہ شان ہے اللہ کی جو تمہارا ربّ ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر شے کا خالق پس اُسی کی بندگی کرو۔ اور وہی ہے ہر چیز کا نگہبان و نگران۔ نگاہیں اُس کے ادراک سے عاجز ہیں لیکن وہ نگاہوں کو پالیتا ہے اور وہ نہایت باریک بین بھی ہے اور حد درجہ باخبر بھی۔!"

اِن آیاتِ مبارکہ میں ایک تو شرک کی اُس سب سے زیادہ عُریاں اور ـــــ گھناؤنی صورت کا ابطال فرمایا گیا ہے۔ جس کا ارتکاب خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں، مان کر کیا جاتا رہا ہے۔ جیسے بنی اسرائیل نے حضرتِ عُزیر علیہ السّلام کو خُدا کا بیٹا قرار دیا اور بنی اسمٰعیل نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے دیا اور سب سے بڑھ کر عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السّلام کو خُدا کا صُلبی بیٹا قرار دے ڈالا۔ عجیب بات ہے کہ ان سب نے خدا کے لیے بیٹے یا بیٹیاں تو مان لیں لیکن کسی کو اُس کی بیوی قرار نہیں دیا۔ یہاں اُن کی اسی بات سے اُن پر دلیل قائم کی گئی کہ جب خدا کے کوئی بیوی ہی نہیں ہے تو اُس کے اولاد کہاں سے ہو گئی! دوسرے اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ وضاحت کی گئی کہ وہ اس کائنات کا مُوجِد و مُبدِع بھی ہے اور خالق و صانع بھی۔ ابداع کہتے ہیں کسی شے کو عدم سے وجود میں لانے یا نیستی محض سے ہستی عطا کرنے کو ـــــ اور خلق کہتے ہیں کسی پہلے سے موجود شے سے کوئی نئی شے بنانے کو جیسے مٹی سے انسان اور آگ سے جنّات کی تخلیق۔ الغرض جُملہ موجوداتِ عالم کا مُوجِد و مُبدِع بھی اللہ ہی ہے اور طبعی یا کیمیائی تبدیلیوں (PHYSICAL & CHEMICAL CHANGES)

سے جو نئی اشیاء ظہور پذیر ہو رہی ہیں ان سب کا خالق بھی اللہ ہی ہے۔

تیسرے یہ کہ ابداع اور خلق مستلزم ہیں اُس کے علیم اور لطیف اور خبیر ہونے کو اِس لیے کہ موجد سے بڑھ کر اپنی ایجاد سے آگاہ اور کون ہو سکتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا سُورۂ ملک میں کہ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ط (کیا پیدا کرنے والا بے خبر ہو سکتا ہے؟ نہیں وہ تو نہایت باریک بین بھی ہے اور باخبر بھی۔)

چوتھے یہ کہ اگرچہ نگاہیں اُس کے ادراک سے عاجز ہیں تاہم بددل ہونے کا کوئی مقام نہیں اس لیے کہ وہ نگاہوں کے اِدراک سے عاجز نہیں ہے۔ تم اسے نہیں دیکھ سکتے کیا ہوا وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے جیسے کہ فرمایا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے احسان کی وضاحت میں کہ "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ" ـــــ (یعنی اُس کی عبادت ایسے کرو کہ گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمھیں دیکھ ہی رہا ہے۔)

پانچویں یہ کہ اُس توحیدِ علمی کا اصل نتیجہ توحیدِ عملی ـــــ یعنی 'توحید فی العبادت' ہونا چاہیئے۔ اِس لیے کہ جب وہی تمھارا ربّ بھی ہے اور خالق بھی تو تمھیں خالصتہً اُسی کی بندگی کرنی چاہیئے اور اُس کی بندگی میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیئے بقولِ شاعر

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی

بعد کی سات آیات میں فرمایا :-

"تمہارے پاس تمھارے ربّ کی طرف سے وہ تمام باتیں آچکی ہیں جن سے حق پوری طرح روشن ہو گیا ہے، تو جس نے مشاہدہ کر لیا اُس نے اپنا ہی بھلا کیا۔ اور جو اندھا ہی بنا رہا تو اُس کا سارا وبال اُسی پر ہے۔ اور مَیں تم میں سے کسی کا بھی ذرّہ برابر ذمّہ دار نہیں ہوں۔ اور اسی طرح ہم اپنی نشانیاں مختلف طریقوں سے واضح کرتے ہیں تاکہ ان کے پاس کوئی عذر نہ رہ جائے اور وہ خود پکار اٹھیں کہ تم نے سمجھانے کا حق ادا کر دیا اور تاکہ ہم پوری طرح وضاحت کر دیں ان کے لیے جو جاننا چاہتے ہوں۔ (اے محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم!) اِس وحی کی پیروی کیئے جاؤ جو تم پر تمھارے ربّ کی طرف سے ہو رہی ہے۔

معبود برحق تنہا وہی ہے، لہٰذا جو اُس کے ساتھ شرک کے مرتکب ہوں تم اُن سے کنارہ کشی اختیار کر لو اور اگر اللہ اُن پر جبر کرتا تو یہ ہرگز شرک نہ کر سکتے اور تمھیں بھی ہم نے اُن پر نہ داروغہ بنایا ہے نہ ہی تم اُن کے ذمّہ دار ہو اور (اے مسلمانو!) مت بُرا بھلا کہو اُن کو جنھیں یہ اللہ کے سوا پُکارتے ہیں۔ مبادا وہ بھی جہالت کے باعث تجاوز کر کے اللہ کو گالیاں دینے لگ جائیں ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ ہم ہر گروہ کے لیے اُس کے اختیار کردہ عمل ہی کو خوشنما بنا دیتے ہیں۔ پھر تمھارے ربّ ہی کی جانب اِن سب کو لوٹنا ہے۔ اس وقت وہ اُن سب کو جتلا دے گا جو وہ کرتے رہے ہیں۔ اور وہ اللہ کی پکّی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے۔ کہہ دو! معجزے تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور (اے مسلمانو!) تمہیں کیا معلوم، کہ یہ لوگ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جو لوگ حقیقت کے انکشافِ اوّل پر ایمان نہیں لاتے ہم اُن کے دلوں اور اُن کی نگاہوں کو اُلٹ دیتے ہیں اور انہیں چھوڑ دیتے ہیں کہ اپنی سرکشی (کے اندھیاروں) میں جس طرح چاہیں بھٹکتے رہیں!"

اِن آیاتِ مبارکہ میں جن عظیم حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ مختصراً یہ ہیں:۔

۱۔ انسان پر اللہ تعالیٰ نے جبر نہیں کیا بلکہ اسے ارادے کی آزادی عطا فرمائی ہے لہٰذا اُس کی ہدایت و ضلالت اور سعادت و شقاوت میں اصل عمل دخل اس کی اپنی نیّت اور طلب کو حاصل ہے۔ اگر وہ خود ہی حق کا طالب اور متلاشی نہ ہو تو نہ کوئی عقلی دلیل اُسے قائل کر سکتی ہے نہ حسّی معجزہ!

۲۔ اگر کسی وقت انسان پر حق منکشف ہو جائے اور اُس کے دل و دماغ گواہی دے دیں کہ حق یہی ہے پھر بھی وہ اپنی ضد یا عناد یا تعصّب یا مصلحت بینی کے باعث اُس سے رُوگردانی کرے تو اِسی دُنیا میں اُسے نقد سزا یہ ملتی ہے کہ اُس سے قبولِ حق کی استعداد سلب کر لی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ اُس کا اختیار کردہ غلط

راستہ ہی اُس کی نگاہوں میں مزیّن ہوتا چلا جاتا ہے۔ اِسی کو قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ختمِ قلوب اور طبعِ قلوب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۳۔ انبیاءِ کرام اور دوسرے داعیانِ حق کی ذمّہ داری صرف یہ ہے کہ حق کو کماحقّہ واضح کر دیں۔ یہاں تک کہ لوگوں کے دل گواہی دے دیں کہ ایضاحِ حق میں کوئی کمی نہیں رہی۔ اس سے آگے لوگوں کو بالفعل ہدایت کی راہ پر لے آنا نہ کسی کے بس میں ہے، نہ کوئی اُس کا ذمّہ دار اور مسئول ہے۔

۴۔ البتہ اس ابلاغ و تبلیغ میں غایت درجہ حکمت ملحوظ رہنی ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ غصّے اور جھنجلاہٹ میں داعیٔ حق بھی مخالفین کی سطح پر اتر آئے اور ان کے معبودانِ باطل کو گالیاں دینی شروع کر دے۔ اس سے بجائے نفع کے الٹا نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔

۵۔ آخری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ داعیٔ حق لوگوں کے اعراض و انکار سے متأثر ہوئے بغیر خود اس حق پر پوری طرح کاربند رہے جس کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیتا ہے۔ اِس لیے کہ معرکۂ حق و باطل میں اصل فیصلہ کن عامل داعیٔ حق کا صبر و ثبات ہی ہے۔ بقولِ علامہ اقبال

دنیا کو ہے پھر معرکۂ رُوح و بدن پیش ۔۔۔ تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ ۔۔۔ ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اس ضمن میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی کہ منکرین اور مخالفین کے اعراض و انکار اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن کی رسّی دراز کیے جانے پر دل گرفتہ ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے، آخر وہ بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ چار و ناچار اِن سب کو اللہ ہی کے حضور پیش ہونا ہے، پھر وہ سب کو ان کے اعمال کے مناسب بدلہ دے گا۔ اہلِ حق کو قبول و اتباعِ حق اور اُس پر استقامت کی جزا اور منکرین اور مکذّبین کو ان کے اعراض و انکار کی سزا!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥

ظ احمد یار صاحب
شعبۂ اسلامیات جامعہ پنجاب

حفاظتِ متنِ قرآن

۴

(۲۷) عہدِ صدّیقی اور عہدِ فاروقی میں اسلام ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک تک پھیل گیا۔ اس عرصے میں لاکھوں غیر عرب بھی اسلام میں داخل ہوئے کسی مسلمان کے قرآن کی تعلیم سے یکسر نابلد ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے اسلامی سلطنت میں ہر جگہ قرآنِ کریم کی تعلیم (حفظ۔ ناظرہ اور فہم) کا کام جاری رہا۔ صحابہ کرامؓ مختلف ممالک و امصار میں پھیل گئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے مفتوحہ علاقوں کے اہم مقامات پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بعض بزرگ صحابہؓ (خصوصاً وہ جنھوں نے عہدِ نبوی ہی میں پورا قرآن نہ صرف حفظ کر لیا تھا بلکہ تحریری طور پر اپنے مصاحف بھی "مصحفِ صدّیقی" کی تدوین سے قبل یا بعد از خود مکمّل کر لیے ——

(دیکھئے اسی مضمون کا پیرا نمبر ۱۹ 'میثاق' جنوری ۱۹۷۶ء صفحہ نمبر ۱۸)

نے اپنے علاقوں میں تعلیمِ قرآن کے مانی اور مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی ازاں جملہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابو موسیٰؓ اشعریؓ عراق میں اور ابی بن کعبؓ شام میں مشہور تھے۔ ویسے تمام صحابہؓ اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے علم کی حد تک مُعلّمِ قرآن کا فرض بھی سرانجام دے رہے تھے —— قرآن کی تعلیم کی وسعت کے ساتھ مکتوب مصاحف کی تعداد میں اضافہ ایک منطقی نتیجہ تھا۔ ۲۰ - ۱۹ھ میں مصر کی فتح کے بعد سے پیپرس (کاغذ) خاصی مقدار میں دستیاب ہونے لگا تھا۔ اس سے بھی مصاحف

کی اشاعت بذریعہ کتابت میں آسانی اور سرعت پیدا ہو گئی اس طرح خلافتِ عثمانی کے آغاز (محرّم ۲۴ھ) تک قرآنِ کریم کی کتابت اور قراءت کا کام وسیع و عریض اسلامی مملکت کے کونے کونے میں ہونے لگا تھا۔ یہ تمام مصاحف —— قرآنِ کریم کے مکمل رائج نسخے —— مختلف صحابہؓ کے حافظے اور ان کے ذاتی و انفرادی مصاحف کے ذریعے نقل در نقل ہو کر اشاعت پذیر ہو رہے تھے —— اس پورے عرصے میں حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے عہد میں باہتمامِ خاص مدوّن ہونے والے نسخے کو استعمال کرنے کی وہ متوقع یا موہوم ہنگامی صورت بفضلِ خدا درپیش ہی نہیں آئی (یعنی حفّاظ کی اکثریت کا معدوم ہو جانا) —— جو اس کی تیاری کا محرّک بنی تھی۔ زیادہ سے زیادہ مدینہ منوّرہ میں قیام پذیر صحابہؓ یا تابعین میں سے بعض اپنے ذاتی مصاحف کی پڑتال یا تکمیل کے لیے وقتاً فوقتاً اس سے مدد لے لیا کرتے تھے۔

(۲۸) کتابت و قراءت قرآن کریم کی اس وسیع پیمانے پر اشاعت کے ساتھ ان دس بارہ برس میں آہستہ آہستہ ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہوا بلکہ خاصی شدّت اختیار کر گیا —— اور یہ تھا اختلافِ قراءات کا مسئلہ۔ یعنی کچھ لوگ قرآنِ کریم کے بعض الفاظ ایک طریقے پر لکھتے اور پڑھتے تھے تو کچھ دوسرے طریقے پر —— اس اختلاف کے پیدا ہونے کے کئی اسباب تھے۔

(۱) ایک بڑی وجہ تو اختلافِ لہجات تھا۔ عرب کے مختلف قبائل کی زبان تو عربی ہی تھی مگر ان کی بولیوں (DIALECTS) لب و لہجہ اور محاورۂ زبان میں اختلافات ضرور تھے مثلاً بنو ہذیل حتّٰی کو عتّٰی بولتے تھے۔ بنو تمیم ہمزہ نہیں بولتے تھے۔ بنو اسد کے لوگ مضارع کو زیر سے پڑھتے تھے مثلاً تَعْلَمُوْنَ کو تِعْلَمُوْنَ اور تَسْوَدُّ کو تِسْوَدُّ —— اسی طرح بعض قبائل لفظِ "اٰسِنٍ" (مَاءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ میں) یاسِنٍ بولتے تھے وغیرہ (اور دنیا کی ہر زبان کے اندر مختلف خطّوں اور لوگوں میں ایسے اختلافات عام ہوتے ہیں) —— فتح مکّہ کے بعد جب عرب کے قریباً تمام قبائل مسلمان ہو گئے۔ اور ان مختلف لہجات رکھنے والے لوگوں کو قرآن پڑھنا ضروری ہُوا (کم از کم نمازوں میں تو کچھ نہ کچھ حصّہ قرآن پڑھنا لازمی تھا) —— تو اس قسم کے الفاظ

ہر قبیلے کے آدمیوں کو اپنے بچپن سے پختہ لب ولہجہ کے مطابق ہی پڑھنا آسان تھا لیکن دوسرے قبیلے کے آدمیوں کو اپنا مخصوص لہجہ چھوڑ کر قرآن کریم کو اہلِ حجاز خصوصاً قریش کے لہجے میں پڑھنا (جو قرآن کا سب سے پہلا لہجہ تھا) دشوار تھا[1]۔ اس پہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے بحکمِ الٰہی ہر ایک قبیلے کو اپنی ہی بولی اور لہجے کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجازت دے دی۔ مختلف قبائل کے متعدّد لوگ قرآن پڑھ کر آگے قرآن پڑھانے بھی لگے۔ فتوحاتِ اسلام کے ساتھ غیر عرب مسلمانوں کی تعداد بڑھی۔ ہر نئے مسلمان کے لیے قرآنِ کریم کی کم از کم ناظرہ تلاوت اور بقدرِ نماز حفظ ضروری تھا ــــــ اب ایسا ہوا کہ مثلاً کسی کو ہذیل کے کسی آدمی سے قرآن پڑھنے کا اتّفاق ہوا ــــــ دوسرے کو کسی اسدی یا تمیمی یا قرشی سے ـ اور ہر ایک املاء اور تلفّظ ــ دونوں میں ــ اپنے ہی استاد کی پیروی کرتا تھا ــ عرب تو پھر بھی اس قسم کے اختلاف کی حقیقت سے آگاہ ہوتے تھے۔ لیکن عجمیوں کے لیے قرآن کے الفاظ میں تلفّظ، لہجے بلکہ املاء کا بھی اختلاف ناقابلِ فہم تھا ــــ ہر شخص اپنے تلفّظ اور املاء کو صحیح اور دوسرے کو غلط کہنے پر مجبور تھا ــــ پھر خدا کے کلام کو "غلط" پڑھنا بلکہ اس پہ اصرار کرنا واقعی کسی بھی مسلمان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا ــ اس لیے وقتاً فوقتاً اس قسم کے جھگڑوں کی اطلاعات ملنے لگیں۔

(۲) اختلافِ قراءات کا دوسرا سبب خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے "سبعہ احرف" کی اجازت بھی تھی۔ اگرچہ مذکورہ بالا لہجاتی اختلاف کے ایک امرِ واقعی ہونے کی بنا پر بعض حضرات نے "سبعہ احرف" سے مُراد بھی یہی لہجات لیے ہیں مگر خود آنحضرت

---

[1] عام الوفود میں جب عرب کے کونے کونے سے قبائل کے نمائندے اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ منوّرہ آتے تھے تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ہر ایک قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ خود انہیں کے لہجہ اور محاورہ میں ہُو بہو انہیں کی طرح بات فرماتے۔ اس پہ حضرتِ علیؓ اور بعض صحابہؓ آپ کی اس قادر الکلامی پہ تعجّب کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم تو ایسا نہیں کر سکتے تو حضوؐر نے فرمایا اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ وَرُبِّیْتُ فِیْ بَنِیْ سَعْدٍ (کہ اوّل تو یہ میرے ربّ نے مجھے سکھایا مزید براں میری پرورش بھی بنو سعد میں ہوئی تھی)

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآنِ کریم کے بعض الفاظ کی ایک سے زائد قراءات بسندِ صحیح ثابت ہیں ـــــ مثلاً مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اور مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ـــــ یا مثلاً فَتَبَيَّنُوْا اور فَتَثَبَّتُوْا۔ اس قسم کا "اجازت یافتہ" اختلاف بھی دوسری قراءت یا اس کی سند سے لاعلمی کے باعث دو پڑھنے والوں میں جھگڑے کا باعث بن جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے اسی مضمون کے پیرا ۱۴ ('میثاق' اکتوبر ۱۹۷۵ء ص ۵۳) میں بیان ہو چکا ہے "سبعہ احرف" ایک تفصیل طلب مضمون ہے۔ یہاں صرف اتنا واضح کر دینا مقصود ہے کہ غیر اہلِ علم کے لیے لہجاتی اختلاف کی طرح یہ ثابت اور "اجازت یافتہ" اختلافِ الفاظ بھی ذہنی الجھن اور دوسروں سے اُلجھ پڑنے کا باعث ہو جاتا تھا۔

(۳) اختلافِ قراءات کا تیسرا سبب ایسی انفرادی خطا اور غلطی بھی ہو جاتی تھی جو کسی خاص سبب سے ! عمداً یا اتفاقاً کسی ایک پڑھانے والے سے سرزد ہوئی اور پھر اس کے تلامذہ نے اسے ہی درست سمجھ لیا۔ اس وقت تک کتابت میں اِعجام و نقطہ نہ ہونے کی وجہ سے اس قسم کی سہو کے امکانات بھی زیادہ تھے۔ اس کی کچھ مثال آج کل کی طباعت یا کتابت کی ایسی اغلاط کی سی تھی جسے پڑھاتے ہوئے استاد بھی درست نہ کر سکا ہو اور شاگرد اسے درستی کی سند قرار دے لے ـــــ اس اختلافِ قراءت میں مزید جذباتی شدت اس وقت پیدا ہو جاتی تھی جب فریقین ایک دوسرے کے قرآن کو غلط اور اُستاد کو کم تر (علمی) درجے کا آدمی قرار دینے لگتے۔ اور اس بحث میں اُن جلیل القدر صحابہؓ کے نام بھی شامل کر لیے جاتے تھے جو اپنے اپنے علاقے میں تعلیمِ قرآن کی سند اور بنیاد تسلیم کیے جاتے تھے ـــــ اس قسم کے اختلاف کو (سابق دو قسم کے اختلافات کے برعکس) کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اس کا وجود بھی تو کم علمی کے باعث ـــــ خصوصاً عجمیوں میں ـــــ جھگڑے کا باعث بن جاتا تھا ـــــ لہٰذا اس قسم کی انفرادی خطا کے امکان کو روکنے کے لیے بھی کسی مثبت اقدام کی ضرورت کا احساس پیدا ہونا لازمی تھا۔

(۲۹) حضرت عثمانؓ کی خلافت کے شروع میں اس قسم کے اختلافات کی بنا پر تصادم اور

جھگڑوں کی خبریں ملنے لگیں۔ تعلیمِ قرآن کے بعض مدرسوں میں اُستادوں کے درمیان اور بعض دفعہ تو شاگردوں اور اُستادوں کے درمیان بھی تصادم ہوتے ہوتے بچا ——— لیکن اس قسم کے تصادم کی سب سے زیادہ پریشان کُن صورتِ حال فوج میں ملاحظہ کی گئی۔ اور یہی چیز دراصل اس وقت زیرِ بحث اہتمام کا فوری محرّک بنی۔ اور شاید اسی لیے کتبِ تاریخ میں عموماً دوسرے اِکّا دُکّا واقعات کی بجائے حضرتِ عثمانؓ کے اقدام کا محرّک ——— آرمینیہ اور آذربائیجان کے محاذ پر پیش آنے والا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے، جس کی تفصیل یوں ہے :

(۳۰) آرمینیہ اور آذربائیجان (موجودہ ایران اور ترکیہ کی سرحدوں کے ساتھ متصل علاقے جو ۱۳ھ سے رُوس کے قبضے میں ہیں) میں مسلمان ویسے تو عہدِ فاروقیؓ میں پہنچ گئے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس محاذ پر کچھ بغاوتیں فرو کرنی پڑیں۔ اور کچھ مزید علاقے بھی مفتوح ہوئے ——— اس محاذ پر ابتداء میں شام کے محاذ سے فوج بھیجی گئی مگر کمک کی ضرورت محسوس ہوئی اور کوفہ (عراق) سے وہاں کے گورنر نے، ایرانی محاذ پر اس وقت مسلمانوں کے مشہور جرنیل حذیفہؓ بن الیمان کو عراقی فوج کے ساتھ مذکورہ محاذ پر بھیجا۔ حذیفہؓ کو جنگ کی اگلی لائنوں تک جا کر بھی لڑنا پڑا۔ یہاں انہوں نے عراقی اور شامی فوجیوں کو اپنے اپنے مصاحف کے اختلافِ قراءات پر آپس میں لڑتے دیکھا ——— عراقیوں اور شامیوں کی مخاصمت یوں بھی بہت پُرانی ——— رومیوں اور ایرانیوں کے زمانے سے ——— چلی آتی تھی ——— ہر ایک میں دوسرے کے مقابلے پر ایک احساسِ برتری پایا جاتا تھا ——— آذربائیجان، آرمینیہ کے محاذ پر ان "تاریخی رقیبوں" کو اسلام کے جھنڈے تلے قریباً پہلی دفعہ اکٹھا ہونے کا موقع ملا ——— تو بعض اُمور میں اس قدیم علاقائی تعصّب کے اثرات کا کچھ مظاہرہ ہونے لگا ——— مثلاً ایک موقع پر مالِ غنیمت کے سلسلے میں بھی عراقی و شامی فوجی آپس میں اُلجھ پڑے ——— دوسرے موقع پر اپنے اپنے افسروں کی حمایت میں بعض عراقی اور شامی شعراء میں تلخ نوک جھونک ہوئی۔ یہ اُمور کسی حد تک نظر انداز کیے جا سکتے تھے۔ لیکن جب قرآنِ کریم کو بھی اس جھگڑے اور رقابت میں داخل کر دیا گیا اور غلطیا

صحیح[1] اختلافاتِ قراءت کو بھی اپنی اپنی فضیلت کے کھاتے میں ڈال کر مذہبی جذبات مشتعل کیے جانے لگے اور وہ بھی عین محاذِ جنگ پر ـــــ تو ـــــ یہ صورتِ حال واقعی خاصی پریشان کن تھی۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اہلِ عراق میں رائج مصاحف کی اصل زیادہ تر مصحف عبداللہ ابن مسعودؓ اور اہلِ شام کے مصاحف کی بنیاد بیشتر مصحف ابیؓ بن کعب تھے۔ اسی طرح بعض دیگر قرّاء صحابہؓ کے مصاحف بھی ان علاقوں میں اشاعتِ قرآن کی بنیاد بنے تھے ـــــ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اختلافِ قراءت پر جھگڑنے والے فریقین "فلاں صحابی کا قرآن" اور "فلاں کا مصحف" کہہ کر اپنی اپنی بات میں فرا وزن پیدا کرنا چاہتے۔ یہ بات اہلِ کتاب کی دینی کتب کے مختلف بزرگوں کے ناموں سے منسوب ہو جانے کے مانند تھی ـــــ مزید برآں جاہلانہ عصبیت کی بنا پر تصحیف کی حمایت کسی وقت عملاً تحریف کی صورت اختیار کر سکتی تھی ـــــ ان سب اُمور نے حضرت حذیفہؓ کو بے چین کر دیا ـــــ اس محاذ پر جانے سے پہلے کوفہ میں بھی اس قسم کے اختلافاتِ قراءات دیکھ کر انہوں نے قرآنِ کریم کے ایک مستند نسخے کی اشاعت کی ضرورت محسوس کی تھی ـــــ محاذ (آرمینیہ) سے واپسی پر وہ پہلے کوفہ آئے۔ وہاں انہوں نے بعض دوسرے صحابہؓ سے اس صورتِ حال اور اپنی تجویز کا ذکر کیا۔ بہت سے صحابہؓ نے ان کی تائید کی ـــــ حذیفہؓ اسی سال حج کے لیے روانہ ہو گئے اور مدینہ منورہ میں حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ ساری رپورٹ دی اور ان سے قرآن میں اختلاف کے سدِّ باب کی تجویز پیش کی ـــــ حضرت عثمانؓ پہلے ہی اس قسم کے واقعات سے متأثر تھے۔ اب انہوں نے صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کیا اور اجماعی طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ قرآنِ کریم کا ایک مستند نسخہ شائع کیا جائے۔ اس کی نقول (جلدیں) مختلف اہم مقامات پر پبلک کے لیے رکھ دی جائیں تاکہ سب لوگوں کو اپنے اپنے مصاحف کی تکمیل اور پڑتال کے لیے ایک

---

[1] دین میں یوں بھی اہلِ علم کم ہوتے ہیں۔ لہجوں اور بولیوں کے لحاظ سے بھی فوج ایک متنوع مزاج ہوتا ہے۔ لاعلمی میں تنوع سے اختلاف اور اختلاف سے نزاع پیدا ہونا بہت زیادہ قرینِ قیاس ہے!

مستند اصل میسّر ہو اور اختلاف کے امکانات کم سے کم رہ جائیں۔

(۳۱) حضرتِ عثمانؓ نے قرآنِ کریم کے اس نئے ایڈیشن کے لیے "مصحفِ صدّیقی" کو ہی اصل بنایا۔ یہ مصحف کسی ہنگامی صورتِ حال میں مراجعت کے لیے ہی تیار کیا گیا تھا۔ اس کی تدوین و کتابت ایک اجتماعی احتیاط کے ساتھ عمل میں آئی تھی۔ اسے بھی حکمتِ الٰہی کہیے کہ اس مہتم بالشان نسخۂ قرآن کے کاتب زیدؓ بن ثابت بقیدِ حیات موجود تھے۔ حضرت عثمانؓ نے سُنّتِ شیخینؓ پر عمل کرتے ہوئے مصحفِ صدّیقی سے نیا ایڈیشن (مزید نقول) تیار کرنے کے لیے حسنِ زید بن ثابتؓ ہی کو مقرر کیا۔ البتہ مدد اور مشورے کے لیے تین آدمیوں ـــــ عبداللہ بن الزبیرؓ ـــ سعیدؓ بن العاص اور عبدالرحمٰنؓ بن الحارث پر مشتمل ایک کمیٹی بھی ان کے ساتھ بنا دی گئی ـــ مصحفِ صدّیقی اس وقت اُمّ المؤمنین حضرتِ حفصہؓ کی تحویل میں تھا۔ نسخہ اُن سے حاصل کر کے نئے نسخے تیار کرنے کا کام شروع کر دیا گیا۔

(۳۲) اس وقت حضرت عثمانؓ اور صحابۂ کرامؓ کے سامنے اصل مسئلہ قرآنِ کریم کے نسخوں کی محض "قلّت" دُور کرنے کے لیے کثیر تعداد میں نقول یا قرآنی نسخے مہیا کرنے کا نہیں تھا۔ اصل مسئلہ اختلافِ قراءات کو ختم کرنا تھا۔ جہاں تک نسخوں کی اغلاط یا ان میں تصحیف کا تعلق تھا اُسے دُور کرنا نسبتاً آسان تھا۔ دِقّت یہ تھی (جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ـــ دیکھئے پیرا ۲۹) ـــــ کہ اختلافِ قراءت کی دو ایسی صورتیں بھی موجود تھیں جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی طرف سے "اجازت یافتہ" تھیں اور دراصل عجمیوں کے لیے ہی وجہِ نزاع بن رہی تھیں یعنی لہجات کا قبائلی اختلاف اور سبعۃ اُحرف کے تحت ثابت تنوّعِ قراءات۔

لہجات کے اختلاف کے بارے میں حضرت عثمانؓ نے بمشورۂ صحابہؓ یہ فیصلہ کیا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے یہ اجازت خاص حالات کی بنا پر قبائلِ عرب کے معمّر لوگوں کی سہولت کے لیے تھی۔ اب جب کہ عجمیوں نے بھی قرآنِ کریم پڑھنا ہے تو اس کے لیے کیوں نہ کوئی یکساں طریق اختیار کیا جائے؟ اور اگر یکسانیت ضروری ہے

تو اس کی بنیاد لہجۂ قریش ہونی چاہیئے کہ شروع میں قرآنِ کریم صرف اسی لہجے کے مطابق پڑھا جاتا رہا تھا۔ اس لیے ایک تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ مختلف قبائلی لہجات اختیار کرنے کی اس اجازت کو ختم کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے مذکورہ بالا کمیٹی کو کتابت و املاءِ الفاظ میں بصورت امکانِ اختلاف لہجۂ قریش کے اتباع کا حکم دیا گیا۔ کمیٹی کے ارکان میں تین قریشیوں کے مقرّر کرنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ سبعۂ احرف کے تحت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے بطریقِ صحیح ثابت تنوّع قراءات کی مقدار اگرچہ اتنی زیادہ نہیں تھی جتنا لفظِ "سبعہ" سے متبادر ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کا ہر ایک لفظ سات مختلف طریقوں پر نہیں پڑھا گیا اور نہ ہی ہر لفظ میں اختلاف لازمی تھا۔ تاہم اس تنوّع یا اختلاف کو لہجات کے اختلاف کی طرح یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ یہ تنوّع بظاہر کسی وقتی مصلحت پر مبنی نہیں تھا بلکہ یہ ایک طرح سے قرآن کا لُغوی کمال اور اَدبی جمال تھا ــــــ بنا بریں اس قسم کے اختلاف یا تنوّع کے بارے میں یہ طے پایا کہ اوّل تو ایسے اختلاف کو سند کی قوّت و صحّت سے پرکھ لیا جائے ــــــ مختلف قراءات میں سے اگر کوئی ایک قرآن ہونے کی قوّتِ سند (تواتر) سے محروم ہو تو اسے ترک کر دیا جائے (مثلاً بعض صحابہؓ کے مصاحف میں تفسیری اشارات بھی تھے جو اصل متنِ قرآن کا حصّہ نہ تھے)۔ اگر کسی لفظ کی دو مختلف قراءتیں یکساں مستند ہوں تو پھر کوشش کی جائے کہ اس کی املاء ایسے طریقے پر کی جائے
کہ دونوں قراءتوں کا احتمال موجود رہےؔ اور بالفرض دو متنوّع قراءات کے لیے ایک طریقِ املاء اختیار کرنا ممکن نہ ہو تو پھر ایک (نسبتاً کم مستند) کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس طرح اس کمیٹی کے لیے طریقِ کار کے جو بنیادی اُصول متعیّن کر دیئے گئے اُن کا خلاصہ یہ تھا کہ (۱) غیر معتبر قراءات سے نصِّ قرآن کو پاک کرنا (۲) معتبر مختلف قراءات کو ایک

سلہ اس وقت تک الفاظ حروف کے نقاط اور حرکات سے عاری ہوتے تھے۔ اس لیں یہ صورت اختیار کی جا سکتی تھی مثلاً لفظ "قل" جسے بعض جگہ قَالَ اور قُلْ دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے یا لفظِ "ملک" جسے سورۂ فاتحہ میں مالک اور ملِک دونوں طرح پڑھنا ثابت ہے۔

نقل میں مدوّن کرنا اور (۳) اس مقصد کے لیے لہجۂ قریش اور تنوّع قراءات کو ملحوظ رکھتے ہوئے املاء یا رسم الخط کا تعیّن کرنا۔ اور دراصل سب سے اہم کام جو اس کمیٹی نے کیا وہ یہی رسم الخط کی تعیین تھی۔ یہ رسم الخط "رسمِ عثمانی" کے نام سے مشہور ہوا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے سے لے کر آج تک پوری دُنیائے اسلام میں قرآنِ کریم کی کتابت میں اسی طریق املاء یعنی "رسمِ عثمانی" کا اتّباع کیا جاتا ہے۔ اِس متعیّن و منضبط اور یکساں رسم الخط کے ذریعے اختلاف قراءات یکسر دُور تو نہ ہو سکا ——— (اس کی وجہ آگے بیان ہوتی ہے) تاہم اختلاف کی صورت میں معتبر اور غیر معتبر قراءت کی تمیز کا بنیادی اُصول طے کر دیا گیا۔

(۳۳) عثمانی ایڈیشن کی تیاری دراصل صِدّیقی ایڈیشن ہی کی نشر و اشاعت کی ایک صورت تھی۔ مُصحفِ صِدّیقی خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے عرضۂ اخیرہ کے مطابق ہونے کی بنا پر ایک طرح سے خود جمع رسولؐ یا "نبوی ایڈیشن" ہی تھا۔ حضرت زیدؓ نے اس وقت بھی کتابت میں حضورؐ کی املاء کرائی ہوئی تحریروں کے حصُول پر زور دیا تھا۔ اور جیسا کہ پہلے پیراؔ ۲۴ 'میثاق' جنوری ۱۹۷۱ء صہ ۲۴ میں بیان ہو چکا ہے)۔ غالبًا مصحفِ صِدّیقی میں سبعہ احرف کا لحاظ رکھ کر املاء متعیّن کی تھی ——— یہی وجہ ہے کہ الفاظ کی املاء کی تعیین یا تبدیلی کے بارے میں اس کمیٹی کے ارکان کے مابین اختلاف کے واقعات نہ ہونے کے برابر بیان ہوئے ہیں۵ ——— اور یہی وجہ تھی کہ کمیٹی نے تھوڑے سے عرصہ میں نئے ایڈیشن کے کم از کم پانچ اور بعض روایات کے مطابق سات آٹھ نسخے تیار کر لیے۔ اور اصل نسخہ حضرتِ حفصہؓ کو واپس کر دیا گیا۔ مصحفِ ابی بکرؓ ایک ہی قسم کے مواد کتابت پر نہیں لکھا گیا تھا۔ مگر مصاحفِ عثمانی جھلّی پر لکھے گئے اس لیے صحائف کی صورت میں نہیں بلکہ ہر ایک ایک مجلّد نسخہ قرآن کی صورت میں تھا۔

---

۵ مثلاً لفظ "تابوت" مصحفِ صِدّیقی میں "تابوة" لکھا گیا تھا۔ وقف کی صورت میں قریش اسے "تابوت" مگر دوسرے لوگ "تابوہ" بولتے تھے۔ اس کے لیے "تابوت" کا رسم الخط اختیار کیا گیا کہ یہ وقف و وصل دونوں صورتوں میں لہجۂ قریش کے مطابق تھا۔

پیپرس (کاغذ) کے مقابلے پر (جو اس وقت بہرحال اسلامی سلطنت میں دستیاب تھا) جلدی کو ترجیح دینے کی وجہ اوّل تو اس کی پائیداری تھی۔ اور اس لیے بھی کہ اس وقت تک (بلکہ بعد میں پہلی دوسری صدی ہجری تک بھی) کتابتِ قرآن کے لیے عموماً وسیع و عریض مواد اور جلی قلم کا استعمال اس کی تعظیم کا تقاضا سمجھا جاتا تھا۔ مصحفِ ابی بکرؓ کی طرح مصاحفِ عثمانی میں بھی اسماءِ سُوَر اور فواصل نہیں تھے البتہ ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ لکھی گئی تھی ماسوائے سورت "التوبہ" کے۔ اسماءِ سُوَر قرّاء میں متعارف تھے مگر متنِ قرآن کو ہر طرح کے غیر قرآنی الفاظ سے پاک رکھنے کے لیے بطورِ عنوان سورت کا نام بھی لکھنا گوارا نہیں کیا گیا مصحف ابی بکرؓ کی طرح یہ نسخے بھی اعجام وسکل (نقاط و حرکات) سے عاری تھے۔ ابھی تک عربی کتابت میں ان چیزوں کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ ان نسخوں میں سورتوں کی ترتیب بھی مصحفِ صدیقی ہی کے مطابق[1] تھی۔ بروایاتِ صحیحہ یہ کام ۲۵ھ کے بعد شروع ہوا اور ۳۰ھ سے پہلے ختم ہو چکا تھا۔

(۴) حضرت عثمانؓ نے ان تیار کردہ نسخوں میں سے ایک ایک نسخہ مختلف صوبوں کے صدر مقامات پر بھجوایا اور حکم دیا کہ یہ مصحف شہر کی جامع مسجد میں پبلک کے لیے ہر وقت موجود رہیں۔ (اس قسم کے عوامی استعمال کا مقابلہ بھی پیپرس (کاغذ) کی بجائے جلدی بہتر کر سکتی تھی) اس مقصد کے لیے مکّۃ المکرّمہ، مدینہ منوّرہ، بصرہ، کوفہ اور دمشق میں ایک ایک نسخے کا بھیجا جانا تو معروف ہے ایک نسخہ حضرت عثمانؓ نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے رکھ لیا تھا۔ ان چھ نسخوں کے علاوہ یمن اور بحرین میں بھی ایک ایک نسخہ بھیجنا بیان کیا جاتا ہے ـــ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ ان مصاحف میں رسم الخط اور املاء کی تعیین کے ذریعے اختلافِ قراءت کو ختم کرنے کے لیے سعیِ بلیغ کی گئی تھی تاہم اس وقت

---

[1] ایک آدھ روایت سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید موجودہ ترتیبِ سُوَر حضرت عثمانؓ کے وقت میں اجتہادی طور پر اختیار کی گئی۔ بفرضِ تسلیم بھی اس سے حفاظتِ متنِ قرآن پر کوئی حرف نہیں آتا۔ تاہم یہ بات عقلاً و نقلاً ناقابلِ تسلیم ہے۔ اس کے لیے عُلُوم القرآن پر تمام اچھی کتابوں میں مُدلّل بحثیں موجود ہیں۔

تک عربی خط میں ہم شکل حروف کی تمیز بذریعہ نقاط (اعجام) اور کلمات کا تلفظ بذریعہ حرکات (شکل) کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا — اس لیے اس ساری محنت اور کوشش کے باوجود الفاظ و کلمات کے مختلف طریقوں پہ پڑھے جانے کا امکان ضرور تھا۔ مگر قرآنِ کریم کے بارے میں عہدِ نبوی ﷺ سے ہی تعیّن قراءت محض احتمالِ کتابت (رسم الخط) سے نہیں بلکہ سندِ روایت سے ہوتا تھا۔ اس کمیٹی نے ایڈیشن میں جن مقامات پر "اجازت یافتہ قبائلی لہجات" یا نسبتاً غیر معتبر "قراءات" کو ختم کرنے کے لیے متعیّن رسم الخط اختیار کیا تھا ان سے بطریقِ سماع و تلقّی آگاہ کرنے کے لیے حضرت عثمان رضؓ نے ہر مصحف کے ساتھ اس کے متعلقہ شہر میں ایک قاری بھی مقرّر کر کے بھیجا۔ خیال رہے کہ قرآنِ کریم تو پہلے بھی ہر جگہ پڑھا اور پڑھایا جا رہا تھا صرف اختلافاتِ قراءات تھے۔ رسم الخط کے تعیّن سے بہت سے اختلافات خود بخود ختم ہو جاتے تھے۔ مقرّر رسم الخط کے باوجود اعجام و شکل کے نہ ہونے کی وجہ سے تلفّظ کی مختلف صورتوں کے امکان کو روکنے کے لیے مستند قاری کے ذریعہ تعلیم ضروری تھی۔ کتابوں میں حضرتِ عثمان رضؓ کے نام فرستادہ اور مقرّر کردہ قرّاء اس طرح دیئے گئے ہیں۔ مدینہ منورہ کے لیے (خود) زید رضؓ بن ثابت مکّہ مکرّمہ کے لیے عبداللہ رضؓ بن السائب۔ شام (دمشق) کے لیے مغیرہ رضؓ بن شہاب کوفہ کے لیے ابو عبدالرحمٰن رضؓ السلمی اور بصرہ کے لیے عامر رضؓ بن قیس[1]۔ (باقی آئندہ)

---

[1] بعض روایات کے مطابق مصحف عثمانی کی تدوین والی کمیٹی کے ارکان کی تعداد دس بارہ تک بیان ہوئی ہے۔ ممکن ہے یہ قرّاء حضرات بھی ان میں شامل ہوں جو املاء اور تلفّظ کے رسمی تعلّق سے اچھی طرح آگاہ تھے اور اس طرح نئے ایڈیشن کو پڑھانے میں ایک ماہر معلّم کا درجہ رکھتے تھے۔

ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے ایم فل (ریڈنگ) پی ایچ ڈی (لندن)

قرآنی تعلیمات اور ایک عصری فلسفیانہ تحریک

میرے اس مضمون کے عنوان سے جو پہلا سوال سامعین کے ذہن میں پیدا ہونا چاہیئے اور جس کی وضاحت طلب کی جانی چاہیئے، وہ یہ ہے کہ وہ فلسفیانہ عصری تحریک یا مکتبِ فکر کون سا ہے، جس کے ساتھ تقابلی مطالعہ میں صفحاتِ ذیل میں کر رہا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی علوم کی درسگاہوں، دانش کدوں اور تعلیم یافتہ حضرات کے ذہنوں میں متعدد مکاتبِ فکر اور زاویہ ہائے نگاہ پائے جاتے ہیں۔ اُن کے نام گنوائے جائیں تو ایک لمبی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن میری نظرِ انتخاب جس تحریک یا فلسفیانہ فکر پر پڑی ہے وہ "وجودیت" یا "فلسفۂ وجود" ہے۔ اس انتخاب کی کئی وجوہات میں بیان کر سکتا ہوں۔ مغرب کی دنیا میں یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ حضرات اور بالخصوص نوجوان علمی طور پر خواہ کسی دوسرے مکتبِ فکر کے ماننے والے ہوں، عملاً وہ وجودیت اور فلسفۂ وجود سے بے حد متأثر پائے جاتے ہیں اور یہ تحریک ان کے عام اخلاق اور طرزِ بود و باش میں بہت گہری اتری ہوئی ہے۔ ثانیاً اس تحریک کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہے۔ غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ چند عمیق اور خالص علمی کتب کے علاوہ اس کی توسیع میں اس نسبتاً عام فہم لٹریچر، ڈراموں اور افسانوں نے لیا ہے، جو آج کے تکنیکی دور میں آناً فاناً پریس سے چھپ کر دنیا بھر کے کتب خانوں اور بازاروں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ثالثاً، تقریباً گزشتہ ربع صدی سے یہ تحریک سیاسی اور معاشرتی سطح پر بے حد فعّال رہی ہے۔ اور اس میں فرانسیسی وجودی مفکّر یاں پال سارتر کے خیالات نے اہم کردار ادا کیا ہے جس کے فکر کے ڈانڈے مارکسزم سے مل جاتے ہیں۔ رابعاً پاکستان

میں منعقد ہونے والی اس علمی مجلس میں اس تحریک کا انتخاب کچھ یوں بھی موزوں ہے کہ خود ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور اصحابِ دانش کی ایک عظیم اکثریت اس مکتبِ فکر کی زلفِ گرہ گیر کی اسیر ہے۔

کسی الہامی کتاب کی تعلیمات کا موازنہ یا تقابلی مطالعہ کسی سیکولر فلسفے سے کرتے ہوئے عموماً ذہن میں چند اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا اور وزنی اعتراض جو اس ضمن میں کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم کی تمام تحریروں یا کوششوں کے پسِ پردہ ایک معذرت خواہانہ ذہن کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس اعتراض کے ذیل میں ان نکات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

۱۔ کسی فلسفیانہ مکتبِ فکر کے ساتھ الہامی تعلیمات کی تشریح و توضیح میں اس بات کا امکان ہے کہ اس فلسفیانہ فکر کا اپنا رنگ الہامی تعلیمات کو بگاڑنے یا اس کی ترمیمات میں افراط و تفریط کا باعث بن جائے۔

۲۔ اس قسم کی کوشش میں اس امر کا خدشہ ہے کہ بالکل سیکولر نوعیت کے فلسفیانہ اجزاء یا خیالات مذہبی تعلیمات کا حصہ بن جائیں۔

۳۔ انتہائی خطرہ اس امر کا ہو سکتا ہے کہ مذہبی عقاید کا انطباق عصری فلسفیانہ خیالات کے ساتھ کیا جائے، اور اس میں مذہب کو کلیتاً موم کی گڑیا بنا دیا جائے۔

اِن اعتراضات کے جواب میں صرف اتنا کہوں گا کہ اس مقالے کا مقصد اسلامی یا قرآنی تعلیمات و عقائد کی توجیہ مذکورہ بالا مکتبِ فکر کے تصورات سے کرنا نہیں۔ بلکہ پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ ہم قرآنی تعلیمات کے بہت سے گوشوں کو اس انداز سے دیکھ سکتے ہیں یا وجودی مفکّرین کی پیش کردہ اصطلاحات اور تصوّرات کے حوالے سے ہم قرآن کی دی ہوئی راہنمائی کو ایسے نئے پیرائے میں پیش کر سکتے ہیں، جو اپنے اندر موجودہ دَور کے پڑھے لکھے حضرات اور نوجوانوں کے لیے اپیل رکھتا ہے۔ اِس طرح ہم دکھا سکتے ہیں کہ ہمارے دین کی تعلیمات صرف اگلے لوگوں کی راہنمائی کے لیے نہ تھیں، بلکہ وہ آج کے تہذیبی ارتقاء اور صنعتی دَور کے معاشرتی تقاضوں سے پیدا شدہ انسانی مسائل کے حل کرنے میں بھی مدد

دے سکتی ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ اسے جدید اذہان کے قابلِ فہم انداز میں پیش کیا جائے۔
فی الواقع وجودیت یا فلسفۂ وجود کلاسیکل معنوں میں ایک مُدوّن اور مبسوط فلسفہ نہیں ہے بلکہ مسائل اور فلسفیانہ سوالات کو ایک خاص انداز سے دیکھنے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اتنا تنوّع اور بوقلمونی شامل ہے کہ ایک طرف وجودیت کے دائرے میں اگر سارتر کے ملحدانہ نظریات شامل ہیں تو دوسری طرف مارسل کے کیتھولک خیالات، کیرکیگارڈ کے پروٹسٹنٹ اور مارٹن بوبر کے یہودیت نواز نظریات بھی اس میں آتے ہیں۔ اور تاریخی طور پر یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ اگرچہ اس خاص طرزِ فکر کو "وجودیت" کا نام پچھلی صدی سے ہی دیا گیا ہو، فی نفسہٖ یہ تاریخِ فلسفہ میں کوئی نیا مظہر نہیں۔ بلکہ بہت سے مؤرّخینِ فلسفہ بالاتفاق یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس سے ملتا جلتا طرزِ فکر ہمیشہ اور ہر دَور میں پایا گیا ہے۔

ایک مختصر سے مقالے میں جہاں محدود وقت کی پابندی ملحوظِ خاطر ہو یہ ممکن نہیں کہ موجودہ دَور کے تمام مفکّرینِ وجودی کے خیالات کا جائزہ لیا جائے، اور فرداً فرداً ان کی تحریروں سے وہ اقتباسات یا شواہد لیے جائیں، جن کے حوالے سے قرآن کی بہت سی تعلیمات کو نئے اذہان کے لیے اُجاگر کیا جا سکتا ہے۔ مَیں یہاں صرف ان چند اہم تعقّلات یا تصوّرات کو قدرے تفصیل سے بیان کروں گا جو اگرچہ تمام وجودی مفکّرین نے اپنائے ہیں لیکن اصلاً جرمن فلسفی وجود، مارٹن ہائیڈیگر کی تحریروں میں شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں!!

وجودیت عقلی یا تصوّری مابعد الطبیعات قسم کا فلسفہ نہیں، بلکہ انسان کے اپنے شعورِ وجود کی فلسفیانہ تحلیل ہے۔ وجودی نظریات انسانی انفرادیت اور داخلی شعورِ ذات کے علمبردار ہیں، اور سائنسی اثباتیت کی بجائے مظاہری تحلیل کا طریق استعمال کرتے ہیں مظہری منہاج مختصراً یہ ہے کہ وجودی مفکّر لاواسطہ تجربے کے ٹھوس معطیات میں دلچسپی رکھتے ہیں اور انہیں "جیسے وہ ہیں" بیان کرنا چاہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، وجودی اپیل اخلاقی وجذباتی تجربے اور ماورائی ہستی کی جانب سے ہے اور اس نے موضوعیت سے تعلق استوار کیا ہے جبکہ ایجابی طریق کی اپیل ان تجربی معطیات کی جانب ہے، جن کی تفصیل سائنس پیش کرتی ہے اور

یہ معروضیت سے منضبط ہے۔ اس نقطۂ نظر کا تقاضا یہ ہے کہ فلسفہ کو فرد کی زندگی، تجربے اور اس تاریخی صورتِ حال سے گہرے طور پر مربوط ہونا چاہیئے جس میں فرد خود کو پاتا ہے۔ فلسفہ ظن وتخمین کا کھیل نہیں بلکہ ایک طرزِ حیات ہے۔ وجودی انسان کے چند اساسی ذہنی موڈز جیسے بوریت، ناسیا، خوف، تشویش اور اندیشۂ موت وغیرہ پر خصوصی توجّہ دیتے ہیں جو انسان کی فطرت اور کائنات سے اس کے تعلّق کے بارے میں سوالات پیدا کرتے ہیں۔

وجودیت کے طرزِ منہاج کی مختصر نشاندہی کے بعد آیئے! ہم دیکھیں کہ ہائیڈیگر وجودیاتِ انسانی کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ ہائیڈیگر مسئلۂ وجود کو اس لیے حل کرنا چاہتا ہے کہ ہستی کا راز پالے۔ اس کے نزدیک انسانی ہستی ہی وہ واحد صورت ہے جس سے ہم فی الحقیقت منضبط ہیں جب ہم کسی فرد کے بارے میں کہتے ہیں کہ وجود رکھتا ہے تو ہائیڈیگر کے ہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خارجی یا مادّی اشیاء سے واضح طور پر ممیّز ہے۔ انسان کا اپنے باطن یا خودی سے ایک مخصوص رشتہ ہے جو اس سے بطور موجود ہونے کے مختص ہے۔ ایک مادّی چیز مثلاً کرکٹ بال کا وجود صرف بحیثیّت ایک مفعول کے ہے، لیکن انسانی وجود اس سے بالکل مختلف ہے وہ بیک وقت فاعل بھی ہے اور مفعول بھی یا بقول ہائیڈیگر وہ فاعل و مفعول دونوں سے ماورا ہے۔ وہ اپنے باطنی وجود سے ہم آہنگ بھی ہوتا ہے اور اُس کے خلاف برسرِ پیکار بھی کبھی وہ اپنے وجود شخصی پر کلیتہً حاوی ہوتا ہے اور کبھی اسے بالکل کھو یا ضائع کر دیتا ہے۔

انسان امکانات کا نام ہے، انسان وجود تو ہے لیکن ناقابلِ تعیّن، یہ بالقوہ وجود ہے جو اپنے امکانات کو بروئے کار لاتے ہوئے ہر لمحہ اور ہر آن خود اپنے سے ماورا ہوتا ہے۔ اس کے امکانات کسی خاص لمحے کے صرف وجودی کوائف تک ہی محدود نہیں ہوتے چنانچہ کسی انسانی وجود کو ہم کلیتہً مادّی اشیاء کی طرح بحیثیّت مفعول بیان نہیں کر سکتے۔ اگرچہ انسانی امکانات سے مراد دُور از کار یا انہونے امکانات نہیں ہیں بلکہ وہ امکانات ہیں جو وہ شعوری ارادے اور انتخاب (CHOICE) سے اپنے وجود کے لیے اختیار کرتا ہے۔

انسان ایک اکائی یا فرد ہے، وجود یعنی شخصی وجود ہمیشہ کسی ذی نفس سے متعلّق ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم انسانی وجود کو خارجی مادّی اشیاء کی طرح قسموں یا درجوں میں تقسیم نہیں کر

سکتے۔ یہ اس سے اِبا کرتا ہے۔ اگر اشیاء کے خواص متعیّن نہ ہوں اور اُن کی گروپ بندی نہ ہو سکے تو عام روز مرّہ زندگی دُوبھر ہو جائے۔ لیکن ہم انسانی افراد کو اس طرح لگی بندھی تقسیم میں نہیں جکڑ سکتے، اس کی تمام اکائیاں منفرد، شخصی اور جُدا جُدا ہیں۔

وجود کی یہ تخصیص اس تصوّر کی تصدیق کرتی ہے جو ہمیں قرآن سے انسان کے بارے میں ملتا ہے، اور یہ نظریہ مادّی نقطۂ نظر یا آج کے سائنسی دَور میں پائے جانے والے نظریۂ انسان کے عین مخالف ہے جس میں انسان کو کائنات کی ٹھوس طبعی اشیاء کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ موجودہ دَور کے سائنس زدہ عمرانی علوم میں انسان کے افعال و حرکات کی حیثیت مشینوں یا بے جان اشیاء کی حرکات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

ہائیڈیگر کے ہاں انسان اور دنیا باہم ایک گہرے ربط میں مربوط ہیں۔ اپنی وجودی ذات کے شعور کے ساتھ ہی اسے خارجی ماحول یا معروضی دنیا کا علم ہوتا ہے، جو اس سے علیٰحدہ اور باہر ایک حقیقت ہے اور جس میں وہ خود مقیم ہے۔ چنانچہ وہ اس طرح ان مابعد الطبیعاتی نظریات کی مشکلات سے بچ جاتا ہے جن میں فاعلی شخصیتیں مختلف النوع اور الگ تھلگ جواہر ہیں، اور خارجی دنیا کا علم اور اثبات ایک لاینحل مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہائیڈیگر کی مشہور مستعمل اصطلاح "وجود در دنیا" (BEING-IN-THE-WORLD) ہے۔ لیکن اس "در" یا "میں" کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جو یہ مثلاً لاہور پنجاب میں ہے، میں ادا کرتے ہیں۔ یعنی ان کا مفہوم مکانی نوعیّت کا نہیں بلکہ باعتبار ہستیّت یا وجودی ہے۔

اِس مقالے میں جو وُجودی اصطلاحات یا تصوّرات مَیں قرآن کے ساتھ مقابلۃً بیان کرنا چاہتا ہوں اور جو ان مفکرین کے لٹریچر میں خاصے بحث و تمحیص کا موضوع بنے ہیں وہ وجود صادق اور غیر صادق یا اصلی اور نقلی زیست (AUTHENTIC AND INAUTHENTIC EXISTENCE) ہیں۔ ہائیڈیگر کے خیال میں وجود یا ہستی کی ایک بڑی خصوصیّت یہ ہے کہ یہ دو قسم کی ہو سکتی ہے صادق یا غیر صادق انسان ان ہی دو صورتوں میں سے کسی ایک کو اپناتا ہے۔ وہ وجود صادق

اور غیر صادق کی بہت مفصل تشریح کرتا ہے لیکن مختصراً وجود صادق رکھنے والے فرد کی نشاندہی ایک اُردو مصرعے میں یوں کی جاسکتی ہے کہ : ع

"دُنیا میں ہوں دُنیا کا طلب گار نہیں ہوں"

ہائیڈیگر کے الفاظ میں انسان دنیا میں ہے لیکن دُنیا کا نہیں ہے۔ اس کا وجود دُنیا میں مادّی اشیاء کے وجود سے مختلف ہے لیکن جب انسان اپنے آپ کو ان مادّی مشتملات کے برابر سمجھنے لگے تو حیات اصلی یا وجود صادق سے وجود غیر صادق میں گر جاتا ہے۔ وجودِ اصلی وہ ہے جس میں انسان علائق اور اسبابِ دنیوی کا غلام ہونے کی بجائے ان پر حاوی اور مختار ہو اور اپنے امکانات اور اپنی دُنیا خود بنائے۔ بالفاظ دیگر یہ وہ حالتیں ہیں جن میں انسان یا تو اپنے آپ کو پالیتا ہے یا کھو دیتا ہے جب تک انسان دنیا کی مصنوعی اور جھوٹی لذّات میں مگن رہتا ہے "کہاں سے" "کیوں" اور "کدھر" کے سوالات اُسے پریشان نہیں کرتے۔ یہ ان کی طرف مطلق دھیان ہی نہیں دیتا لیکن جب اس پر کبھی ایک خاص مُوڈ یا رُجحان طاری ہوتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ دُنیا میں اجنبی سا ہے تب وُجودی مہمات کے سوالات اس کے ذہن میں اُبھرتے ہیں زندگی کے حقائق اور مقتضیات سے منہ پھیرنا نقلی زیست کی راہ پر چلنا ہے۔

ظاہر ہے کہ حیاتِ اصلی یا وجودِ صادق کے تصوّر میں یہ مفہوم شامل ہے کہ انسان حیاتِ اصلی اسی وقت بسر کرتا ہے جب کہ وہ بحیثیّت انسان اپنے امکانات اور مقاصد کو پورا کر رہا ہوتا ہے۔ اور حیاتِ نقلی یا غیر صادق وہ ہے جس میں اُس کے امکانات اور مساعی کا ارتکاز کسی ادنیٰ چیز پر ہو۔ اس شکل میں اس کی خودی منتشر ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اُسے اپنے اصل مقاصد کا علم تک نہیں رہتا اور وہ ناقابلِ حُصول ہو جاتے ہیں۔

وجود اصلی یا حیاتِ صادق کا تصوّر قرآن کے بتائے ہوئے تصوّرِ انسان کے بہت مشابہ ہے۔ قرآن کے مطابق انسان کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے ایک واضح مقصد کے تحت کی ہے۔ تخلیقِ جسد اور تسویے کے بعد آدم کو اپنی روح میں سے پھونک کر ملکوتی یا

رُوحانی عنصر سے نوازا۔ دنیا میں بنی نوع انسان کے بھیجے جانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ یہاں خلیفۃ اللہ بن کر رہے اور اسی حق تعالیٰ کی فرمانروائی یہاں جاری کرے، یعنی وہ اس ارض پر خالقِ کون و مکاں کا نائب ہے۔ خود اسی کی عبادت اور اطاعت کا حق ادا کرے، اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے۔ لیکن جب انسان خالق کی بجائے مخلوقات کے سامنے سجدہ ریز ہونے لگے اور انہیں معبود بنائے تو وہ اپنے اس مقصدِ تخلیق سے ہٹ جاتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے۔ وہ شرک و معصیت کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ خیر و بھلائی کی صلاحیت اُس سے بالکل سلب کر لی جاتی ہے ـــــ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ایمان اور اس کی مسلسل تجدید اور آبیاری ہمیں اپنے مقصدِ اصلی کے قریب رکھ سکتی ہے اور وہ ایمان اور اس کے مقتضیات کو پورا کر کے مقصدِ تخلیق کا بارِ گراں اُٹھا سکتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے خالق کا محبوب بن سکتا ہے۔ مذہبی وجودیت اور قرآنی تعلیمات میں یہ قدرِ مشترک ہے کہ دونوں حیات غیر صادق سے حیاتِ صادق کی طرف تبدیلی ممکن سمجھتی ہیں۔ انسان اپنے ضمیر اور اخلاقی حِس کی آواز پر لبیک کہہ کر نفسانی خواہشات کو کنٹرول کر لے تو پھر حیاتِ جاوداں کے دروازے اُس کے لیے کھلے ہیں۔

یہ مقالہ تیسری سالانہ قرآن کانفرنس میں پیش کیا گیا

آئندہ کراچی میں
مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی
اور مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
کی جملہ مطبوعات بشمول ماہنامہ 'میثاق' کے لیے

قاضی عبدالقادر ۲/۲ V A ناظم آباد کراچی - ۱۸

سے رجوع کریں اُن کا فون نمبر ۶۱۳۳۷۷ ہے !

دستورِ تنظیمِ اسلامی

مشتمل بر :-

- قراردادِ تأسیس مع توضیحات
- نام اور شرائط شمولیّت
- ہیئت تنظیمی اور قواعد وضوابط
- حلف نامۂ رفاقت

شائع کردہ

مرکزی مکتبۂ تنظیمِ اسلامی

۱۲- افغانی روڈ، سمن آباد- لاہور

قیمت فی نسخہ — (فون : ۴۱۳۹۴۵) — ایک روپیہ

حصّہ اوّل

مشتمل بر:

قرارداد تاسیس مع توضیحات

قرارداد تاسیس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مُمد و مُعاون ہو۔

ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاقی و رُوحانی تکمیل اور فلاح و نجات، دین کا اصل موضوع ہے اور پیشِ نظر اجتماعیّت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حُصول میں مدد دے۔

لہٰذا پیشِ نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیئے کہ اس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کماحقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور اتباعِ سنّت سے ان کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں ان کی حس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لئے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔ ان تمام امور کے لئے ذہنی اور علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عملی تربیت اور تاثیرِ صحبت کے اہتمام کی جانب خصوصی توجہ ناگزیر ہے۔

دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک "الدّین النصیحۃ" کی رُوح اور "الاقرب فالاقرب" کی تدریج ضروری ہے۔ لہٰذا دعوت و اصلاح کے عمل کو فرد سے اولاً کنبہ اور خاندان اور پھر تدریجاً ماحول کی جانب بڑھنا چاہیئے۔ اس ضمن میں نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام ناگزیر ہے۔

عامّۃ النّاس کو دین کی دعوت و تبلیغ کی جو ذمّہ داری امّتِ مُسلمہ پر بحیثیّتِ مجموعی عائد ہوتی ہے، اس کے ضمن میں ہمارے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ جاہلیّتِ قدیمہ کے باطل عقائد و رسوم اور دورِ جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کا مدلّل ابطال کیا جائے اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لئے کتاب و سُنّت کی ہدایت و رہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ ان کی اصلی حکمت اور عقلی قدر و قیمت واضح ہو اور وہ شبہات و شکوک رفع ہوں جو اس دور کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔"

توضیحات

قرار داد میں جن اُمور کی وضاحت کی گئی ہے ان میں اوّلین اور اہم ترین امر یہ ہے کہ "ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاقی اور روحانی تکمیل اور فلاح و نجات، دین کا اصل موضوع ہے اور پیشِ نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے اصل نصبُ العین یعنی رضائے الٰہی کے حُصول میں مدد دے"! ـــــ اس تصریح کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ماضی میں مسلمانوں کو ان کی یہ ذمّہ داری تو بالکل ٹھیک یاد کرائی گئی کہ جس دین کے وہ مدّعی ہیں اسے دنیا میں عملاً قائم کرنے کی سعی و جہد بھی ان پر فرض ہے اور یہ کہ دین محض ذاتی عقائد اور کچھ مراسم عبودیّت یعنی انسان اور رب کے مابین پرائیویٹ تعلّق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی پُوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اپنے احاطے میں لینا چاہتا ہے لیکن ان اُمور پر اس قدر زور دیا گیا کہ بندے اور رب کے مابین تعلّق کی اہمیّت اور افراد کی اپنی علمی، اخلاقی اور رُوحانی ترقّی نظر انداز ہوتی چلی گئی، آئندہ جو کام پیشِ نظر ہے اس کے اُصُول و مبادی میں یہ نکتہ بہت زیادہ قابلِ لحاظ رہے گا کہ ایک مسلمان کا اصل نصبُ العین صرف نجاتِ اُخروی اور رضائے الٰہی کا حُصول ہے اور اس کے لیے اسے اصل زور اپنی سیرت کے تطہیر و تزکیے اور اپنی شخصیّت کی تعمیر و تکمیل پر دینا ہوگا جس سے تعلّق مع اللہ اور محبّتِ خدا اور رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم میں اضافہ ہوتا رہے اور اس میں زیادہ سے زیادہ اخلاص پیدا ہوتا چلا جائے۔ دین کی تائید و نصرت اور شہادت و اقامت یقیناً فرائض دینی میں سے ہیں لیکن ان کے لیے کوئی ایسی اجتماعی جدّ و جُہد ہرگز جائز نہیں ہے جو افراد کو ان کے اصل نصبُ العین سے غافل کر کے انھیں محض ایک دُنیوی انقلاب کے کارکن بنا کے رکھ دے! ـــــ چنانچہ پیشِ نظر اجتماعیّت میں اوّلین زور افراد کی دینی

اخلاقی تربیت پر دیا جائے گا اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے گا کہ ــــ "اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جِلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور اتباعِ سنّت سے ان کا شغف اور ذوق وشوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں ان کی حِس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لیے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔"

"دینی جذبات کے جِلا" کے لیے قرآن مجید کی بلاناغہ تلاوت مع تدبّر، سیرتِ نبویؐ اور سیر الصحابہؓ کا مطالعہ، مجالسِ وعظ کا انعقاد، باہمی مذاکرۂ آخرت اور مضامینِ موعظت پر مشتمل آسان لٹریچر کی اشاعت پر زور دیا جائے گا۔

"علم میں مسلسل اضافے" کے لیے عربی زبان کی تحصیل کی عام ترغیب اور اس کا اہتمام قرآنِ حکیم اور حدیثِ نبویؐ کے باقاعدہ حلقہ ہائے درس کا قیام اور جاہلیّتِ قدیمہ و جدیدہ پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تنقیدی کُتب کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا دونوں اُمُور سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جاہلیّتِ قدیم و جدید دونوں کے اثرات قلوب و اذہان سے محو ہوں، عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو اور صحیح اسلامی عقائد کی تخم ریزی و آبیاری ہو سکے۔

شرکائے تنظیم کے دینی جذبات کے جِلا اور علم میں اضافے کا براہِ راست اثر عملی زندگی پر پڑے گا اور ان کی زندگیوں میں دینی تبدیلی عملاً پیدا ہوتی چلی جائے گی لیکن اس میدان میں اس امر کی شدید ضرورت ہوگی کہ اس بات کی کڑی نگرانی کی جائے کہ یہ تبدیلی ہمہ جہتی ہو اور اعمالِ انسانی کے مختلف گوشوں میں متناسب انداز میں ظہور پذیر ہو۔ چنانچہ عبادات میں ذوق وشوق، معاملات میں احتیاط و تقویٰ اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں شغف اور دلچسپی متناسب انداز میں بڑھے۔ بہ صورتِ حال کہ جلسوں کے انعقاد کے ضمن میں تو پابندی بھی ملحوظ رہے اور جوش و خروش کا بھی مظاہرہ کیا جائے لیکن نماز باجماعت کی پابندی گراں محسوس ہو اور نوافل سرے سے خارج از بحث ہو جائیں۔ دین کی نصرت و

حمایت کا جذبہ تو ترقی کرتا چلا جائے لیکن تزکیۂ باطن کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے، یا سُنّتِ نبویؐ کی محبّیت و اہمیّت پر دلائل تو ازبر ہوں لیکن خود اپنی زندگی میں اتّباعِ نبویؐ کی جھلک نظر نہ آئے، نہ صرف یہ کہ افراد کے حق میں سمِّ قاتل ہے بلکہ خود اجتماعیّت کے لیے بھی سخت مضر اور مہلک ہے ـــــ لہٰذا اس امر کی کڑی نگرانی ضروری ہوگی کہ شرکاء میں عبادات سے شغف، اتّباعِ سُنّت کا جذبہ، معاملات میں حلال و حرام کی حُدود و قیود کی پابندی اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں سے دلچسپی توافق و تناسب کے ساتھ بڑھیں۔ خصوصاً یہ احتیاط تو انتہائی لازمی ہوگی کہ پیشِ نظر اجتماعیّت کے تنظیمی ڈھانچے میں جو لوگ آگے آئیں وہ تیزی و مستعدی اور نفاست و باقاعدگی سے کام کرنے کی صلاحیّت کے اعتبار سے چاہے کسی قدر تہی دست ہوں، عبادات اور اتّباعِ سُنّت کے ذوق و شوق سے ہرگز تہی دامن نہ ہوں۔

شرکائے جماعت میں مندرجہ بالا تبدیلیاں ـــــ یا بالفاظِ دیگر ان کے نفوس کے تزکیہ اور ان کی شخصیّت کی دینی تعمیر کے لیے جہاں ذہنی و علمی رہنمائی اور فکری تربیت لازمی و لابُدّی ہیں وہاں عملی تربیت اور تاثیرِ صحبت کا مؤثّر اہتمام بھی ضروری و ناگزیر ہے۔ اس غرض کے لیے مختلف مقامات پر تربیت گاہوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جا سکتا ہے اور ایک ایسی مرکزی تربیت گاہ کا قیام بھی عمل میں لایا جا سکتا ہے جس میں مختلف مقامات کے رفقاء گروپس (GROUPS) کی صورت میں شریک ہوں اور ایک مقرّرہ میعاد میں انھیں قرآن و حدیث کے منتخب حصص کا درس بھی دیا جائے اور ایک ایسی دینی فضا بھی مہیّا کی جائے جس میں ان کے دینی جذبات بھی از سرِ نو تر و تازہ ہو لیں اور ایک خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کا عملی تجربہ بھی حاصل ہو جائے۔

قرار داد کے بنیادی نکات میں سے دوسرا اہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ـــــ "دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک 'اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ' کی روح اور 'اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ' کی تدریج ضروری ہے۔" پیشِ نظر اجتماعیّت لازماً یہ چاہے گی کہ اس کا ہر شریک نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اتّباع میں داعی اِلی اللہ اور اپنے ماحول میں حسبِ

مقدور و صلاحیت اور بقدرِ ہمت و استطاعت ہدایت کا ایک روشن چراغ بن کر رہے اور اس کی شخصیت پر بحیثیت مجموعی داعیانہ رنگ غالب ہو جائے۔

اس دعوت کا اصل محرک ابنائے نوع کی ہمدردی اور نصح و خیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہیئے اور اس میں نہ تو اپنی شخصیت کی نمود کا کوئی شائبہ شامل ہونا چاہیئے نہ طلبِ جاہ کا۔ حتیٰ کہ اللہ، رسولؐ اور شریعت کی وفاداری کے جذبے کے تحت اگر کبھی کسی فرد گروہ یا ادارے پر تنقید کی نوبت آجائے تو اس میں بھی ہمدردی اور دلسوزی غالب رہے اور ذاتی رنجش یا انتقامِ نفس کا کوئی شائبہ نہ پیدا ہونے پائے۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ ـــــ ہمارے معاشرے کا مجموعی مزاج اگرچہ دین سے بہت دُور جا چکا ہے اور اس اعتبار سے انتہائی اصلاح طلب ہے لیکن دعوت و اصلاح کے عمل میں دو حقائق کا لحاظ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ یہ معاشرہ ایک مجموعی اکائی ہے اور اس کے تمام طبقات میں انحطاط سرایت کر چکا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے مختلف طبقات میں کمیت کا تھوڑا بہت فرق چاہے موجود ہو کوئی بنیادی امتیاز موجود نہیں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ انحطاط براہِ راست نتیجہ ہے جذباتِ ایمانی کے ضعف اور کتاب و سُنّت کے علم کی کمی کا۔ اس میں دین دشمنی کا عنصر چند ایسی استثنائی صورتوں کے سوا موجود نہیں ہے جو اگرچہ بجائے خود تو بہت خطرناک ہیں اور ان سے خبردار رہنے کی بھی ضرورت ہے تاہم مجموعی اعتبار سے ہمارے معاشرے کے عام بگاڑ کا اصل سبب دین دشمنی نہیں بلکہ دین سے لاعلمی ہے! حکومت اس معاشرے کا جامع عکس اور اربابِ اقتدار اس کا اہم جُزو ہیں اُن کو اپنی اہمیت اور معاشرے میں اثر و نفوذ کی قوت و صلاحیت کے اعتبار سے دعوت و تخاطب میں اوّلیت تو دی جا سکتی ہے اور دی جانی چاہیئے لیکن انھیں دین کا دشمن قرار دے کر ان کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کرنے کے لیے عوام کے دینی جذبے کو مشتعل کرنا درآں حالیکہ خود عوام کی ایک عظیم اکثریت کا حال دین سے بے خبری اور عملی بُعد کے اعتبار سے خود کم و بیش وہی ہے جو اصحابِ قوت و

اختیار کا، نہ ان کی خیر خواہی ہے نہ خود دین کی۔ رہا اقتدار کے حصول کی خاطر برسرِ اقتدار طبقے کے مخالف و معاند کی حیثیت اختیار کرنا تو یہ ہمارے نزدیک دینی نقطۂ نگاہ سے نہایت مضر ہی نہیں سخت مہلک ہے جس سے کلّی اجتناب لازمی و لابدّی ہے۔ ہمارے نزدیک "ائمۃ المسلمین" اور "عامتھم" دونوں ہی نصح و خیر خواہی کے برابر مستحق اور دعوت و اصلاح کے یکساں محتاج ہیں!

یہاں یہ تصریح بھی ضروری ہے کہ ہماری دانست میں انتخابات کے ذریعے عمومی اصلاح کا نظریہ نری خام خیالی پر مبنی ہے، بحالاتِ موجودہ تو اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ انتخابات کے ذریعے اصلاح کی اُمید کی جائے۔ ویسے بھی ہماری رائے میں انتخابات میں دوسری جماعتوں کے مخالف و مقابل کی حیثیت سے شرکت، دعوت و اصلاح کے صحیح منہج کے منافی ہے اور اس سے قبولِ حق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

داعی کے قلب میں اپنے ابنائے نوع کے لیے جس ہمدردی اور نصح و خیر خواہی کا ہونا لازمی ہے، اسی کا ایک اہم مظہر رافت و رحمت اور شفقت و رقّت کا وہ جذبہ ہے جو ابنائے نوع کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور عملی زندگی میں خدمتِ خلق اور ایثار و انفاق کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ دعوتِ دین اور خدمتِ خلق کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں بلکہ بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ دین کا وہ داعی جو خادمِ خلق نہ ہو اپنی دعوت میں دولتِ اخلاص سے محروم ہے۔ اس ضمن میں یہ فرق البتہ ضرور پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ خدمتِ خلق کی اجتماعی سکیموں کو زیرِ عمل لانا بالکل دوسری بات ہے اور افراد میں خدمتِ خلق کے جذبے کا پیدا ہونا اور بڑھنا بالکل دوسری چیز ہے۔ خدمتِ خلق کی اجتماعی سکیموں کی اہمیّت اپنی جگہ کتنی ہی مُسلّم ہو، دعوتِ دین کے نقطۂ نظر سے اصل مطلوب افراد کے قلوب میں شفقت و رحمت کے جذبے اور عمل میں ایثار و انفاق کی کیفیّت کا ظہور ہے۔ پیشِ نظر اجتماعیت

میں اصل زور انشاء اللہ اسی پہ دیا جائے گا!

دعوت کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کا تخاطب لازماً ایک تدریج کے ساتھ داعی کے اپنے نفس سے شروع ہو کر (عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ) اپنے اہل و عیال (قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا) اور کنبے قبیلے (وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ) سے ہوتے ہوئے اپنی قوم (يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ) اور پھر پوری انسانیت (لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ) تک پہنچنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک یہ صورت کہ داعی اپنے آپ کو بھول جائے اور برّ و تقویٰ کی ساری دعوت دوسروں کو دیتا رہے (اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ) یا اپنے خاندان اور کنبے قبیلے کو تو بھول جائے اور دُور دراز کے لوگوں میں ہدایت کی سوغات بانٹنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو۔ نہایت خطرناک مرض کی علامت ہے۔ دعوت کے عمل کا صحیح نہج یہ ہے کہ اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ کے اُصول پر آگے بڑھے اور جس سے جتنی قربت اور محبت داعی کو ہو دعوت و تخاطب میں اسی قدر اسے مقدّم رکھا جائے۔ اس سلسلے میں یہ خیال البتہ صحیح نہ ہوگا کہ ایک مرحلے کی تکمیل کے بعد ہی دوسرا مرحلہ شروع کیا جائے۔ مطلوب صرف یہ ہے کہ دعوت کے عمل کو ایک فطری تدریج اور حسین تناسب کے ساتھ اپنی ذات، اہل و عیال، کنبے قبیلے اور پھر عوام النّاس تک بڑھنا چاہیے۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنی اولاد اور فی الجملہ نئی نسل کے بارے میں خصوصی توجّہ و اہتمام سے کام لینا ہوگا اس لیے کہ ان کے بارے میں ہم حدیثِ نبویؐ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ .... الخ کی رُو سے براہِ راست مسئول اور ذمّہ دار ہیں۔ اولاد کی دینی تعلیم و تربیت کا یہ اہتمام ذاتی و انفرادی بھی ہوگا اور جہاں جہاں ممکن ہوگا اور وسائل دستیاب ہوسکیں گے اس امر کی سعی بھی کی جائے گی کہ ایسے مدارس اپنے اہتمام میں قائم کیے جائیں جن میں نئی نسل کے قلوب و اذہان میں ایمان کی تخم ریزی و آبیاری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کیا جائے۔

اس سلسلے میں متعدد رفقاء نے پہلے سے جو کوششیں اپنی انفرادی حیثیت میں شروع کر رکھی ہیں، کوشش کی جائے گی کہ ان کو ایک باقاعدہ نظم کے تحت لا کر ان کی افادیت میں حتی الامکان اضافہ کیا جائے اور ان کے تجربات سے دوسرے مقامات پر مدارس کے قیام و اہتمام میں فائدہ اٹھایا جائے۔

وسائل دعوت کے ضمن میں کوئی تعین غیر ضروری ہے۔ حسب صلاحیت و استعداد انفرادی و نجی گفتگو، خطاب ہائے عام، خطباتِ جمعہ اور درسِ قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کے تمام جدید طریقوں کو اختیار کیا جا سکتا ہے!

قرار داد کا تیسرا اہم نکتہ "عامۃ الناس کو دین کی دعوت و تبلیغ" کی اس ذمہ داری سے بحث کرتا ہے جو "اُمّتِ مسلمہ پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہے"۔ ہمارے نزدیک انذار و تبشیر، دعوت و تبلیغ اور شہادتِ حق علی الناس کی جو ذمہ داریاں انبیائے کرام علیہم السلام پر عائد ہوا کرتی تھیں۔ وہ اب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کے ختم ہو جانے کے بعد آپ کی امت پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے۔ اوّل اوّل اس امت نے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نظام کے تحت اپنی اس ذمہ داری کو اجتماعی حیثیت سے ادا کیا۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے خاتمے کے بعد بھی ایک عرصے تک مسلمان حکومتیں اس فرض منصبی کو ادا کرتی رہیں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اتقیاء و صلحا ذاتی طور پر دور دراز علاقوں میں پہنچ کر دین کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ ادھر عرصے سے یہ سلسلہ بھی تقریباً ختم ہو چکا ہے اور اُمّتِ مسلمہ بحیثیت مجموعی "کتمانِ حق" کے جرم کی مرتکب ہو رہی ہے اور صورتِ حال یہ ہے کہ اُمّت کی تمام اجتماعی سرگرمیاں صرف اپنے دفاع اور دنیوی ترقی و استحکام تک محدود ہیں۔ کچھ تھوڑا بہت دینی رنگ کسی اجتماعی سرگرمی میں ہے بھی تو وہ محض اُمّت کی داخلی اصلاح کی حد تک ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صورتِ حال سخت تشویشناک ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ اُخروی

بازپرس کا اندیشہ ہے، بلکہ ہماری رائے میں ہماری دنیوی نکبت و ذلّت کا اصل سبب بھی یہی ہے!

اس ضمن میں ہمارے نزدیک اس وقت کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ ایک طرف ادیانِ باطلہ کے مزعومہ عقائد کا مؤثّر و مدلّل ابطال کیا جائے اور دوسری طرف مغربی فلسفہ و فکر اور اس کے لائے ہوئے زندقہ و الحاد اور مادّہ پرستی کے سیلاب کا رخ موڑنے کی کوشش کی جائے اور حکمتِ قرآنی کی روشنی میں ایک ایسی زبردست جوابی علمی تحریک برپا کی جائے جو توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی حقائق کی حقانیت کو بھی مبرہن کردے اور انسانی زندگی کے لیے دین کی رہنمائی و ہدایت کو بھی مدلّل و مفصّل واضح کردے۔ ہمارے نزدیک اسلام کے حلقے میں نئی اقوام کا داخلہ، اور جسدِ دین میں نئے خون کی پیدائش ہی نہیں خود اسلام کے موجودالوقت حلقہ بگوشوں میں حرارتِ ایمانی کی تازگی اور دین و شریعت کی عملی پابندی اسی کام کے ایک مؤثّر حد تک تکمیل پذیر ہونے پر موقوف ہے: اس لیے کہ دورِ جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کے سیلاب میں خود مسلمانوں کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بڑی تعداد اس طرح بہہ نکلی ہے کہ ان کا ایمان بالکل بے جان اور دین سے ان کا تعلّق محض برائے نام رہ گیا ہے اور اسی بنا پر دین میں نت نئے فتنے اُٹھ رہے ہیں اور ضلالت و گمراہی نت نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔

اس سلسلے میں انفرادی کوششیں تو اب بھی جیسی کچھ بھی عملاً ممکن ہیں جاری ہیں اور آئندہ بھی جاری رہیں گی۔ ضرورت اس کی داعی ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو وسائل فراہم کیے جائیں اور ایک ایسے باقاعدہ ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو حکمتِ قرآنی اور علمِ دینی کی نشر و اشاعت کا کام بھی کرے۔ اور ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا بھی مناسب اور مؤثّر بندوبست کرے۔ جو عربی زبان، قرآن حکیم اور شریعتِ اسلامی کا گہرا علم حاصل کرکے اسلامی اعتقادات کی حقّانیت کو بھی ثابت کریں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ہدایات اسلام نے دی ہیں انھیں بھی ایسے انداز میں پیش

کریں جو موجودہ اذہان کو اپیل کر سکے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیشِ نظر تنظیم ہرگز "الجماعت" کے حکم میں نہ ہوگی۔ الجماعۃ کا مقام ہماری دانست میں اُمّتِ مسلمہ کو بحیثیتِ مجموعی حاصل ہے۔ پیشِ نظر اجتماعیت کی حیثیت مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کی ہوگی جس میں وہ لوگ شریک ہوں گے جو خود اصلاحِ نفس اور تعمیرِ سیرت کے خواہش مند ہوں اور ان جملہ انفرادی و اجتماعی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہیں جو دین کی جانب سے ان پر عاید ہوتی ہیں تاکہ ایک طرف اُن کا باہمی تعاون ایک دوسرے کے لیے سہارا بن سکے اور دوسری طرف اصلاحِ معاشرہ کے لیے ایک مؤثر قوت فراہم ہو جائے ——— دین کی خدمت نہایت وسیع و عظیم کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہے ہیں اور انشاء اللہ ان کے ساتھ ہمارا رویّہ تعاون و تائید ہی کا ہوگا ——— اپنے فہم و فکر کے مطابق ہم بھی دین کی خدمت کی ایک ادنیٰ کوشش کے لیے جمع ہو رہے ہیں اور یہ توقّع کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ دین کے تمام خادم ہمیں اپنے رفیقِ راہ ہی گردانیں گے ——— اس تصریح کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ہم واقعۃً تمام دینی عناصر خصوصاً علمائے کرام کے تعاون کی شدید احتیاج محسوس کرتے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

حصّہ دوم

مشتمل بر:

نام اور شرائط شمولیّت

دفعہ ۔ ۱

اس تنظیم کا نام "تنظیم اسلامی" ہوگا

دفعہ ۔ ۲

ہر عاقل و بالغ شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور خواہ وہ کسی بھی ذات برادری یا نسل سے تعلق رکھتا ہو اور خواہ وہ روئے زمین کے کسی بھی خطّے میں رہائش پذیر ہو اس تنظیم میں شامل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ :۔

ا: پورے شعور و ادراک کے ساتھ اقرار کرے کہ:

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ، اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے اسماء و صفات سے ظاہر ہے اور قبول کرتا ہوں اس کے جملہ احکام، اقرار کرتا ہوں زبان سے اور تصدیق کرتا ہوں دل سے! ۔ اور

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر، اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر، اور یوم آخر پر، اور تقدیر پر کہ اس کی بھلائی اور

بُرائی سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر۔

تشریح: اسلام کی اساس ایمان پر قائم ہے اور ایمان کی تعبیر کے لئے ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصّل کے مندرجہ بالا الفاظ جو سلف سے منقول ہیں، حد درجہ موزوں بھی ہیں اور نہایت جامع و مانع بھی۔ اس لئے کہ ان میں ایمانیات کی تفصیل کے علاوہ دو اہم اور بنیادی نکتے بھی واضح ہو جاتے ہیں: ایک یہ کہ ایمان زبانی اقرار (جو اُس قانونی ایمان یعنی اسلام کا رکنِ اوّلین ہے جس پر تمام دنیوی معاملات کا دار و مدار ہے اور جس پر اسلامی ہیئتِ اجتماعی کی بنیاد قائم ہوتی ہے) اور تصدیقِ قلبی (جس پر اُس حقیقی ایمان کا دار و مدار ہے جس کی بنا پر آخرت میں کوئی شخص مومن قرار پائے گا) دونوں کا مجموعہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ علمی و نظری اور اصولی اعتبار سے ایمان حقیقتاً ایمان باللہ ہی کا نام ہے۔ بقیہ تمام ایمانیات اسی اصل کی فروع اور اسی اجمال کی تفصیل ہیں، چنانچہ ایمان بالآخرت بھی اللہ تعالےٰ کی صفاتِ حکمت و عدل ہی کا مظہر ہے اور ایمان بالرسالت بھی اس کی صفاتِ ربوبیت و ہدایت ہی کی توسیع۔

اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ——— وہ '**اَلْاَحَد**' ہے یعنی ہر اعتبار سے تنہا اور اکیلا۔ چنانچہ نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں، نہ حقوق میں نہ اختیارات میں، نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے نہ ہم کفو، نہ ہم سر ہے نہ ہم پلّہ، نہ ضدّ ہے نہ نِدّ، نہ مِثل ہے نہ مثال ——— وہ '**الصَّمَد**' ہے یعنی وہ پورے سلسلۂ کون و مکان کا مبدع بھی ہے اور موجد بھی، خالق بھی ہے اور باری بھی، صانع بھی ہے اور مصوّر بھی، اور اسی کی توجّہ و عنایت اسے تھامے ہوئے بھی ہے اور قائم کیے ہوئے بھی۔

وہ پاک اور منزّہ و مبّرا ہے ہر عیب، ہر نقص، ہر کمی، ہر ضعف، ہر احتیاج، ہر غلطی اور ہر کوتاہی سے، گویا وہ '**سُبُّوح**' بھی ہے اور '**القدّوس**' بھی ——— اور جامع ہے تمام محاسن و کمالات کا، اور ہر خیر اور خوبی کا بدرجہ تمام و کمال، گویا وہ '**الغنی**' بھی ہے اور '**الحمید**' بھی، کسی کو کوئی قوت و طاقت

حاصل نہیں بجز اس کے اذن واجازت کے، گویا وہی "العلیّ" بھی ہے اور "العظیم" بھی اور "المتعال" بھی ہے اور "الکبیر" "المتکبّر" بھی ـــــ سبحان اللہ والحمد للہ ولا إلٰہ الّا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوّۃ الّا باللہ العلیّ العظیم

اس کی ذات وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے اور اس کی ماہیّت اور کنہہ کو کوئی نہیں جان سکتا۔ اور اس کی معرفت کی واحد راہ اس کے اسماء وصفات کے واسطے ہی سے ہے چنانچہ تمام اچھے نام اسی کے ہیں اگرچہ متعین طور پر اس کے اسماءِ حسنیٰ وہی ہیں جو قرآن اور حدیث نبویؐ میں وارد ہوئے ـــــ اسی طرح وہ تمام صفاتِ کمال سے بتمام وکمال متّصف ہے جن میں سے اہم ترین آٹھ ہیں یعنی حیات[1]، علم[2]، قدرت[3]، ارادہ[4]، سمع[5]، بصر[6]، کلام[7] اور تکوین[8]، چنانچہ وہی "الحیّ" بھی ہے اور "القیّوم" بھی اور "السمیع" بھی ہے اور "البصیر" بھی، "علیٰ کلّ شیءٍ قدیر" بھی ہے اور "بکلّ شیءٍ علیم" بھی، "فعّالٌ لما یرید" بھی ہے اور "إنّما أمرہٗ اذا أراد شیئاً أن یقول لہٗ کن فیکون" کی شان کا حامل بھی ـــــ مزید برآں اس کی جملہ صفات اس کی ذات ہی کے مانند مطلق ولامتناہی ہیں نہ کہ محدود و مقیّد، اور قدیم ہیں نہ کہ حادث اور ذاتی ہیں نہ کہ کسی اور کی عطا کردہ،

فرشتے وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نور سے تخلیق فرمایا۔ وہ صاحبِ تشخّص وجود کے حامل ہیں نہ کہ مجرّد قوائے طبعیہ، ان کا نہ مذکّر ہونا معلوم ہے نہ مؤنّث، وہ خدا سے قرب ضرور رکھتے ہیں لیکن الوہیّت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، وہ اللہ کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم انہیں بارگاہِ خداوندی سے ملے، وہ اللہ کے احکام کی تنفیذ بھی کرتے ہیں اور خالق ومخلوق کے مابین پیغام رسانی بھی، چنانچہ وہی انبیاء ورُسُل تک وحی لاتے رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے لیکن چار بہت مشہور بھی ہیں اور جلیل القدر بھی یعنی حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل

حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام۔

اللہ کی کتابوں میں سے بھی چار ہی معلوم و معروف ہیں، یعنی توراۃ جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوئی اور زبور جو حضرت داؤدؑ کو عطا ہوئی اور انجیل جو حضرت عیسیٰؑ کو عطا ہوئی اور قرآن جو حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا۔ جو اللہ کی آخری کتاب اور نوعِ انسانی کے نام اللہ کا آخری اور مکمل پیغام ہے، جس کے بعد کوئی اور کتاب نازل نہ ہوگی اور جو مِن وعَن محفوظ موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ جبکہ باقی تینوں کتابیں ردّ و بدل اور تغیر و تحریف کا ہدف بن چکی ہیں، گویا اب قرآن ہی ان کا 'مُصَدِّق' بھی ہے اور 'مُھَیْمِن' بھی ——— ان کے علاوہ اور بھی بہت سے پیغمبروں کو صحیفے عطا ہوئے جن میں سے کچھ اب دنیا میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، باقی محرّف اور متبدّل ہیں۔

اللہ کے رسول نوعِ انسانی کے وہ برگزیدہ افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے وقتاً فوقتاً چنا اور پسند فرمایا۔ وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے اور سب گناہ سے پاک یعنی معصوم تھے، ان کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے، قرآن مجید میں جن کے نام مذکور ہیں ان کے سوائے کسی اور کو یقین کیساتھ نبی یا رسول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان میں سے پانچ حد درجہ اولوالعزم اور نہایت عالی مرتبہ ہیں یعنی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیّدنا محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم ——— ان میں سے بعض کو بعض پر بعض پہلوؤں سے جزوی فضیلت حاصل ہے لیکن جملہ انبیاء و رسل پر فضیلتِ کلّی سیّد وُلدِ آدم حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، جو خاتم النبیین بھی ہیں اور آخر الرسل بھی۔ اور جن کے بعد وحیِ نبوّت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کلّی طور پر بند ہو چکا ہے۔

انبیاء و رسل کی تائید و تقویت کے لئے اللہ تعالیٰ عام مادّی ضوابط کو عارضی طور پر معطل کر کے گویا عادی قانون کو توڑ کر اپنی آیات ظاہر کرتا اور معجزات دکھاتا رہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بے شمار حسّی معجزے عطا ہوئے لیکن آپ کا اہم ترین اور

عظیم ترین معجزہ معنوی ہے یعنی قرآن حکیم۔

یوم آخر وہ دن ہے جس میں تمام انسان دوبارہ زندہ ہو کر عدالتِ خداوندی میں محاسبے اور جزا وسزا کے فیصلے کے لئے پیش ہوں گے جس کے نتیجے میں یا جنّت میں داخلہ ہوگا یا جہنّم میں ـــــ اس دن اقتدارِ مطلق اور اختیارِ کلّی صرف اللہ واحد و قہّار کے ہاتھ میں ہوگا۔ نہ کسی کو کسی جانب سے کوئی مدد مل سکے گی، نہ کوئی کچھ دے دلا کر چھوٹ سکے گا، نہ کوئی سفارش ہی خدا کی پکڑ سے بچا سکے گی۔ انبیاء ورُسل، صلحاء و اتقیاء، ملائکہ و ارواح اور سب سے بڑھ کر نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مراتبِ عالیہ کے اظہار و اعلان اور ان کے اعزاز و اکرام کے لئے شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور گنہگار اہل ایمان کے حق میں ان کی شفاعت قبول بھی ہوگی لیکن نہ وہ خدا کی مرضی اور منشا کے خلاف کچھ کہیں گے اور نہ ہی خدا کی صفتِ عدل باطل ہوگی

تقدیر کے خیر و شر کا من جانب اللہ ہونا یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ قادرِ مطلق ہے اور مخلوقات میں سے کسی کے بس میں نہیں کہ بغیر اسکی اجازت محض اپنے ارادے سے کچھ کر سکے لہٰذا یہاں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے، خواہ وہ کسی کو بھلا لگے یا بُرا، اللہ کے اذن ہی سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو خدا کا عاجز و لاچار ہونا لازم آتا ہے۔ مزید برآں، وہ "عَالِمِ مَاکَانَ وَ مَایَکُوْنُ" بھی ہے چنانچہ اس پورے سلسلۂ کون و مکان میں جو کچھ ماضی میں ہوا، یا حال میں ہو رہا ہے یا مستقبل میں ہوگا سب اس کے علم قدیم میں پہلے سے موجود ہے، اگرچہ اس کا یہ علم جبرِ محض کو مستلزم نہیں ـــــ گویا 'ایمان بالقدر' دراصل اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی قدرت اور علم کے مضمرات اور مقدّرات ہی کو ماننے کا نام ہے!

بعث بعد الموت سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا نفخۂ اولیٰ ہوگا جس کے نتیجے میں کائنات کا پورا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور سب پر ایک عمومی موت طاری ہو جائے گی۔ پھر جب اللہ کا اذن ہوگا نفخۂ ثانیہ ہوگا اور سب جی اٹھیں گے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تا قیام قیامت پیدا ہونے والے آخری انسان تک سب میدان حشر میں جمع کئے جائیں گے!

ب: کلمۂ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے جملہ مضمرات ومقدرات کے فہم وشعور کے ساتھ گواہی دے کہ:

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔

تشریح: ۱۔ اس شہادت کے جزوِ اوّل کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان اور جو کچھ آسمان وزمین میں ہے سب کا خالق، پروردگار، مالک اور تکوینی وتشریعی حاکم صرف اللہ ہے، ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ گویا "اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" ــــــ اور "لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْد" اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ:

۱۔ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی وکارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریادرس اور حامی وناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہے ہی نہیں۔

۲۔ اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقوے اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرے، کیونکہ تمام اختیارات کا مالک تنہا وہی ہے۔

۳۔ اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لئے نہ پکارے۔ کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش قضائے الٰہی کو ٹال سکتی ہو، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں، خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء۔

۴۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں، کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

۵ ۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ تسلیم نہ کرے، کسی کو باختیارِ خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے، کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اور اُن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کردے جو ایک اللہ تعالےٰ کی اطاعت کے تحت اور اُس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں، کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے ۔ اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا ۔

نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ :

۶ ۔ انسان اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جائے، اپنی خواہشِ نفس کی بندگی چھوڑ دے اور اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے ۔

۷ ۔ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالکِ مختار نہ سمجھے، بلکہ ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان، اپنے اعضاء اور اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اور اس کی طرف سے امانت سمجھے ۔

۸ ۔ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اُسے قیامت کے روز اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے ۔

۹ ۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے ۔

۱۰ ۔ اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی تمام سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھیرائے ۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی اس کا محبوبِ حقیقی اور مطلوب و مقصودِ اصلی بن جائے ۔

۱۱ ۔ اپنے لئے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت تسلیم کرے اور ہر اُس طریقے اور ضابطے کو رد کردے جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہو ۔

اس شہادت کے جزوِ ثانی سے واضح ہوتا ہے کہ سیّد وُلدِ آدم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ آپؐ اللہ کے بندے ہیں اور دوسرے یہ کہ آپؐ اللہ کے

رسول ہیں ۔ پہلی حیثیت کے اعتبار سے آپ عبدیّت کاملہ کے مقام پر فائز ہیں اور آپ کی اس حیثیت کے علم اور اعتراف سے شرک کی ان جملہ اقسام کا کامل سدّ باب ہو جاتا ہے جن میں سابقہ امتیں اپنے اپنے انبیاء و رسل کے فرطِ احترام، شدّتِ عقیدت اور غلوِ محبت کے باعث مبتلا ہو گئیں اور دوسری حیثیت کے اعتبار سے آپؐ کے فرقِ مبارک پر ختمِ نبوّت اور ختمِ رسالت کا تاج بھی ہے اور آپ کے دستِ مبارک میں شہنشاہِ ارض و سماء کی جانب سے اِتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیلِ دینِ حق کا فرمانِ شاہی بھی۔ گویا سلطانِ کائنات کی طرف سے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبیؐ کے ذریعہ سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطۂ قانون بھیجا گیا اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کیا گیا، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ۔

اس امرِ واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان کو جملہ مخلوقات میں شدید ترین محبت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو اور آپؐ کی اطاعت اور اتباع ہی زندگی کا اصل طریق بن جائے گویا:

۱ ۔ انسان ہر اُس تعلیم اور ہر اُس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو ۔

۲ ۔ اس کو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لئے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسولِ خدا سے ثابت ہے ۔ اس کے سوا کسی دوسری دلیل پر اس کی اطاعت موقوف نہ ہو ۔

۳ ۔ رسولِ خدا کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے ۔ دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ کے تحت ہو، نہ کہ ان سے آزاد ۔

۴ ۔ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سُنّت کو حجّت اور سند اور مرجع قرار دے، جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سُنّت کے مطابق ہو اسے اختیار کرے، جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کر دے، اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اسے حل کرنے کے لئے اُسی سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرے ۔

۵ ۔ تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی، یا قبائلی و نسلی، یا قومی و وطنی، یا فرقی و گروہی۔ کسی کی محبت یا عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسولِ خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آجائے یا اس کی مدِ مقابل بن جائے۔

۶ ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کو نہ تو کسی بھی معنی میں نبی یا رسول سمجھے نہ معصوم اور نہ ہی کسی کا یہ منصب اور مرتبہ سمجھے کہ اس کے ماننے پر انسان کا مومن و مسلم سمجھا جانا منحصر ہو۔

نیز اسی کے متضمنات کی حیثیت سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:

۷ ۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ آپؐ نے جو نظام قائم فرمایا اور جو خلافتِ راشدہ کے دوران بتمام و کمال قائم رہا، وہی "دینِ حق"، اور "نظام اسلامی" کی صحیح ترین اور واحد مسلّمہ تعبیر ہے۔ گویا خلافتِ راشدہ فی الواقع "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" تھی۔ اور خلفائے اربعہ یعنی حضرات ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ اور علی حیدرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاھم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ "خلفائے راشدین و مہدیین" ہیں جن کی سنت آنحضورؐ کے بعد دین میں حجت کا درجہ رکھتی ہے۔

۸ ۔ یہ یقین رکھا جائے کہ صحابۂ کرام رضوان تعالےٰ علیہم اجمعین جنہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپؐ کی تعلیم اور تزکیہ و تربیت سے براہ راست فیضیاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی من حیث الجماعت پوری اُمت میں افضلیتِ مطلقہ کے حامل ہیں۔ حتّٰی کہ کوئی غیر صحابی کسی صحابی سے افضل نہیں ہو سکتا۔ ان کی محبت جزو ایمان ہے، ان کی تعظیم و توقیر دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر ہے اور ان سے بغض و عداوت اور ان کی تحقیر و توہین درحقیقت آنحضورؐ سے بغض و عداوت اور آپؐ کی تحقیر و توہین ہے ـــــ ان کے مابین جزوی فضیلت کے

بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں لیکن فضیلت کلی متعین طور پر اس طرح ہے کہ تمام صحابہؓ میں ایک اضافی درجۂ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحاب بیعت رضوان کو، پھر ان پر ایک مزید درجۂ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحاب بدر کو، پھر ان پر ایک اور درجہ فضیلت کے حامل ہیں حضرات عشرۂ مبشرہؓ اور ان میں افضلیت علی ترتیب الخلافت ہے یعنی افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ، پھر درجہ ہے حضرت عمر فاروقؓ کا پھر مقام ہے حضرت عثمان غنیؓ کا اور پھر مرتبہ ہے حضرت علی حیدرؓ کا !

مزید برآں صحابہ کرامؓ کل کے کل "عدول" ہیں اور ان کے مابین اختلاف و نزاع نفسانیت کی بنا پر نہیں بلکہ خطائے اجتہادی کی بنا پر ہوا۔ چنانچہ مشاجرات صحابہؓ کے باب میں محتاط ترین روش تو یہ ہے کہ "کفِّ لسان" سے کام لیا جائے اور کامل سکوت اختیار کیا جائے تاہم کوئی حقیقی اور واقعی ضرورت ہی لاحق ہو جائے تو ایک کو "مصیب" یعنی صحیح موقف پر اور دوسرے کو "مخطی" یعنی راہِ خطائے اجتہادی پر تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن کسی کو بھی سب و شتم یا الزام و اتہام کا ہدف بنانا جائز نہیں ہے !

ج : ہر قسم کے کفر اور جملہ انواع و اقسام شرک اور تمام رذائل و ذمائم اخلاق سے شعوری طور پر اعلان براءت کرے، بایں الفاظ کہ :

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ شَيْئًا وَّ اَنَا اَعْلَمُ بِهٖ وَاَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا اَعْلَمُ بِهٖ تُبْتُ عَنْهُ وَتَبَرَّاْتُ مِنَ الْكُفْرِ وَالشِّرْكِ وَالْكِذْبِ وَالْغِيْبَةِ وَالْبِدْعَةِ وَالنَّمِيْمَةِ وَالْفَوَاحِشِ، وَالْبُهْتَانِ وَالْمَعَاصِیْ كُلِّهَا

یعنی "اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیرے ساتھ کسی کو جانتے بوجھتے شریک کروں اور تجھ سے مغفرت کا طلبگار ہوں اگر کبھی بے سمجھے بوجھے ایسا ہو جائے اور میں اعلان براءت کرتا ہوں ہر نوع کے کفر سے ۔

شرک سے، جھوٹ سے، غیبت سے، بدعت سے، چغلخوری سے، بے حیائی
کے کاموں سے، بہتان طرازی سے اور جملہ نافرمانیوں سے۔"

تشریح : ایمان کی طرح کفر کی بھی دو قسمیں ہیں ایک کفرِ حقیقی یا کفرِ قلبی، اور دوسرے کفرِ قانونی یا کفرِ ظاہری ـــــ کفرِ حقیقی یا کفرِ قلبی کا اطلاق اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کی ناقدری و ناشکری اور اس کی ہر معصیت اور ہر نافرمانی پر ہو جاتا ہے لیکن جہاں تک اس کفرِ قانونی یا کفرِ شرعی کا تعلق ہے جس کی بنا پر کسی کی تکفیر کر کے اس کا رشتۂ ملتِ اسلامی سے منقطع کر دیا جائے تو وہ ضروریاتِ دین میں سے کسی کے انکار ہی سے لازم آتا ہے، مجرد بے عملی یا نافرمانی حتیٰ کہ کبائر کے ارتکاب سے بھی لازم نہیں آتا۔

اسی طرح شرک کی بھی بے شمار اقسام ہیں مثلاً بعض شرک اعتقادی ہیں اور بعض صرف عملی، بعض جلی ہیں اور بعض خفی، تاہم جملہ انواع و اقسامِ شرک کا ایک احصار اور احاطہ اس طرح ممکن ہے کہ ایک شرک فی الذّات ہے یعنی یہ کہ کسی کو کسی اعتبار سے خدا کا ہم جنس، یا ہم کفو بنا دیا جائے جس کا کامل رد ہے سورۂ اخلاص میں۔ دوسرے شرک فی الصّفات ہے یعنی کسی کو کسی صفت کے اعتبار سے خدا کا مثل یا مثیل بنا دیا جائے جس کا نہایت مکمل سدّباب ہے آیۃ الکرسی میں، اور تیسرے شرک فی الحقوق ہے جس کی جامع ترین تعبیر شرک فی العبادت ہے جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کوئی خدا سے بڑھ کر یا اُس جتنا محبوب و مطلوب ہو جائے اور یہ بھی کہ کسی کو علی الاطلاق مطاع مان لیا جائے یعنی اس کی اطاعت خدا کی اطاعت سے آزاد تسلیم کر لی جائے، اور یہ بھی کہ عام مادّی قانون اور ظاہری قواعد و ضوابط کے دائرے سے باہر کسی سے استعانت اور استمداد و استغاثہ کیا جائے یا اس سے دُعا کی جائے اور اسے پکارا جائے (عام مادّی قوانین کے تحت بھی اگر کسی کے بارے میں یہ خیال ہو کہ محض اپنی قوت اور ارادے سے کسی کو نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہے تو یہ شرک فی الصّفات کی ایک قسم یعنی شرک فی القدرت اور شرک فی التصرّف ہوگا) مزید برآں شرک کی اسی نوع کے ذیل میں آتے ہیں ریا اور سمعہ بھی اور کسی کے لئے کسی بھی نیّت سے ان مراسمِ عبودیت کو بجا لانا بھی جو صرف اللہ

کے لئے خاص ہیں جیسے سجدہ اور نذر!

رذائل و ذمائم اخلاق کی مکمل فہرست دینا ممکن نہیں۔ تاہم اگر انسان ان سے اجتناب کرے جو اوپر بیان ہوئے تو دوسروں کا سدباب خود بخود ہو جائے گا!

د: سابقہ زندگی کے تمام گناہوں پر نہایت الحاح وزاری سے بارگاہ خداوندی میں مغفرت کا طلبگار ہو اور آئندہ کے لئے کامل خلوص و اخلاص کے ساتھ توبہ کرے، ان الفاظ کے ساتھ کہ:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُہٗ عَمَدًا اَوْ خَطَاً سِرًّا اَوْ عَلَانِیَۃً وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ مِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ اَعْلَمُ وَمِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ لَا اَعْلَمُ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ وَسَتَّارُ الْعُیُوْبِ وَغَفَّارُ الذُّنُوْبِ

"یعنی میں اللہ سے معافی کا خواستگار ہوں تمام گناہوں پر خواہ میں نے جان بوجھ کر کئے ہوں یا غیر ارادی طور پر، اور خواہ چھپ چھپا کر کئے ہوں خواہ علانیہ طور پر، اور خواہ وہ میرے علم میں ہوں خواہ میرے علم میں نہ ہوں۔ اے اللہ تو ہی تمام غیبوں کا جاننے والا اور تمام عیبوں کی پردہ پوشی کرنے والا اور تمام گناہوں کی بخشش فرمانے والا ہے!"

تشریح: توبہ صرف زبان سے کلماتِ توبہ کے ادا کر دینے یا ان کے ورد یا وظیفہ بنا لینے کا نام نہیں ہے بلکہ گناہ پر حقیقی ندامت اور واقعی پشیمانی اور معصیت سے کلّی اجتناب کے عزم مصمّم کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں رجوع کرنے اور گناہ و معصیت کو بالفعل ترک کر دینے کا نام ہے یہ تین شرائط ان کوتاہیوں کے ضمن میں کافی ہیں جو حقوق اللہ کے باب میں ہوں، حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے معاصی کے لئے ایک چوتھی اضافی شرط یہ ہے کہ جس کسی پر زیادتی ہوئی ہو اس کی تلافی کی جائے یا اس سے معافی حاصل کی جائے۔

نیز یہ توبہ کی صحت کے لئے لازم ہے کہ جو شخص تنظیم اسلامی میں شمولیت کا خواہاں ہو وہ:

۱ ۔ جملہ فرائض دینی کی پابندی اختیار کرے اور تمام کبائر سے فی الفور مجتنب ہو جائے ۔ بالخصوص ارکان اسلام کی پوری پابندی کرے ۔ چنانچہ نماز قائم کرے (مردوں کے لئے التزام جماعت بھی ضروری ہے) ، رمضان المبارک کے روزے رکھے ، صاحب نصاب ہو تو باقاعدہ حساب کے ساتھ پوری زکوٰۃ ادا کرے ۔ اور صاحب استطاعت ہو اور تا حال حج بیت اللہ نہ کیا ہو تو فوراً نیت کرے اور جلد از جلد فریضۂ حج ادا کرے ۔

۲ ۔ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ سے زیادہ اتباع کرے اور ایسی تمام بدعات اور رسومات کو ترک کر دے جن کا ثبوت قرونِ مشہود لہا بالخیر میں نہ ملتا ہو ۔

تشریح :۔ ان بدعات و رسومات کا زیادہ زور شادی بیاہ، پیدائش، عقیقہ، ختنہ، سالگرہ، فوتیدگی اور تیوہاروں کے مواقع پر ہوتا ہے ۔ ان سب میں لازم ہو گا کہ اپنے معاملات کو زیادہ سے زیادہ قرونِ اولیٰ کے مطابق بنایا جائے اور بعد کے اضافوں کو ترک کر دیا جائے ۔

۳ ۔ اگر کوئی ایسا ذریعۂ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کے ذیل آتا ہو جیسے چوری، ڈاکہ، سود، شراب، زنا، رقص و سرود، شہادتِ زور، رشوت، خیانت جوا اور سٹہ وغیرہ تو اسے ترک کر دے ۔

تشریح : اس بات کا تو بظاہر احوال کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ لوگ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے خواہاں ہوں جن کی معاش چوری یا ڈاکہ، شراب کی تیاری یا اس کی فروخت وغیرہ، عصمت فروشی یا رقص و سرود ایسے قبیح کاموں سے متعلق ہوں تاہم اگر اللہ تعالیٰ ایسے کسی کاروبار سے متعلق کسی فرد کو اصلاح کی توفیق دے تو یہ بھی اس کی رحمت سے بعید نہیں ۔ بہرصورت ان تمام کاموں کی حرمت اور قباحت و شناعت ہمارے معاشرے میں معلوم و معروف ہے ـــــ البتہ بعض حرام چیزیں کچھ اس طرح ہمارے معاشرے میں جاری و ساری ہو گئی ہیں کہ عام لوگ یا تو اُن کی قباحت سے ہی آگاہ نہیں رہے یا انہوں نے کسی مجبوری کے عذر کی بنیاد پر ان کو اپنے لئے مباح کر لیا ہے ۔ ان میں سے مکروہ ترین چیز ہے سُود ، جس سے باز نہ آنے پر قرآن حکیم اللہ اور

اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلانِ جنگ کی وعید سناتا ہے اور دوسرے نمبر پر ہے رشوت اور سرکاری حیثیت اور اختیار کا ناجائز استعمال اور ان منزلوں میں بیع و شرا کی بعض ناجائز صورتیں اور سرکاری محاصل (انکم ٹیکس، کسٹم ڈیوٹی وغیرہ) سے بچنے کے لئے اخفاء و کذب بیانی۔

ہمیں خوب اندازہ ہے کہ اس وقت جو خدا ناشناس اور عاقبت ناآشنا نظام پوری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے اور پُورا انسانی معاشرہ بحیثیتِ مجموعی جس فسادِ اخلاقی میں مبتلا ہے اس کے پیشِ نظر ان تمام چیزوں سے کامل اجتناب نہایت مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن تنظیمِ اسلامی جن مقاصد کے لئے قائم کی جا رہی ہے اس کے پیشِ نظر لازم ہے کہ اس سے عملی وابستگی کے لئے وہی لوگ آگے بڑھیں جو رخصتوں اور حیلوں پر عمل کرنے کے بجائے عزیمت اور صبر و توکل کو اپنا شعار بنائیں اور ہر اس ذریعۂ معاش کو ترک کرنے کی کوشش کریں جس میں حرام کی آمیزش ہو۔ اس معاملے میں سردست حسبِ ذیل تصریحات پر اکتفا کی جاتی ہے:۔

۱۔ سُود لینا اور دینا قطعاً حرام ہیں لہٰذا بنکوں یا دیگر اداروں سے نہ کبھی کوئی رقم کسی بھی غرض کے لئے سُود پر قرض لینے کی اجازت ہوگی نہ سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈیپازٹ یا نفد رقم پر معیّنہ منافع کی کسی بھی دوسری صورت میں سرمایہ لگانے کی اجازت ہوگی چنانچہ بنکوں سے صرف عام سروسز جیسے ترسیلِ زر یا لاکرز سے انتفاع یا زیادہ سے زیادہ کرنٹ اکاؤنٹ رکھنے کی اجازت ہوگی۔

۲۔ کسی ایسے کاروباری ادارے کی ملازمت کی بھی اجازت نہ ہوگی جس میں سُود کو غالب عنصر کی حیثیت حاصل ہو جیسے بنک اور انشورنس کمپنیاں۔

۳۔ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔ البتہ کسی ایسی صورت میں کہ کسی ظالم اہلکار یا صاحبِ اختیار کو اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے کچھ مجبوراً دینا پڑے تو اس کا شمار استحصال بالجبر میں ہوگا رشوت میں نہیں۔ البتہ یہ صرف اسی صورت میں ہوگا کہ نہ کوئی ناجائز انتفاع مطلوب ہو، نہ کسی سرکاری قانون اور پابندی سے بچنا مقصود ہو اور نہ ہی

کسی اور کے جائز حقوق پر زد پڑتی ہو۔

۴ - سرکاری محاصل کے ضمن میں جن رعائتیں مروجہ قانون کے اندر اندر ممکن ہوں ان سے بڑھ کر کسی ایسی صورت کو اختیار کرنے کی اجازت نہ ہوگی جس میں کذب، فریب اور شہادتِ زور شامل ہوں۔

۵ - کاروبار کی مختلف صورتوں میں سے بھی جن جن میں بیع فاسد یا جوئے یا سٹے یا احتکار وغیرہ کا عنصر شامل ہو اس سے بچنا لازم ہوگا۔

۶ - اگر اس کے قبضے میں ایسا مال یا جائداد ہو جو حرام طریقے سے آیا ہو یا جس میں حق داروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دستبردار ہو جائے اور اہل حقوق کو ان کے حق پہنچا دے۔ البتہ یہ عمل صرف اس صورت میں کرنا ہوگا جب کہ حق دار بھی معلوم ہوں اور وہ مال بھی معلوم و متعین ہو جس میں ان کا حق تلف ہوا ہے بصورت دیگر توبہ اور آئندہ کے لئے طرزِ عمل کی اصلاح کافی ہوگی۔

۷ - اپنی معاشرت میں جملہ اسلامی احکام کی پابندی کرے خصوصاً ستر اور حجاب کے شرعی احکام پر عمل پیرا ہو۔

۸: گہرے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرے کہ وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف اللہ کا ہو کر رہے گا، رضائے الٰہی ہی اس کا اصل مقصود و مطلوب ہوگی اور نجات و فلاحِ اُخروی کا حصول ہی اس کا اصل نصب العین ہو گا ——— اور جس طرح اس کی نماز اور قربانی صرف اللہ کے لئے ہوگی اسی طرح اس کے جسم و جان، مال و منال حتیٰ کہ زندگی اور موت سب اللہ ہی کے لئے ہوں گے۔ یعنی

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ ——— اور ———

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

تشریح : ہر ذی شعور مسلمان کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اپنی پوری زندگی اس کی کامل اطاعت میں دیدے (جو لازماً اطاعتِ رسولؐ ہی کے واسطے سے ہوگی!) اسی رویّے کا نام عبادتِ رب ہے جو ہر انسان سے اللہ کا پہلا مطالبہ ہے اور جس کی طرف نوعِ انسانی کو دعوت دینے کے لئے تمام انبیاء و رسل مبعوث ہوئے اور جو از روئے قرآن جنّوں اور انسانوں کا عین مقصدِ تخلیق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر لازم ہے کہ اپنی صحت و قوت، فرصت و فراغت، صلاحیت و استعداد، مال و دولت اور وسائل و ذرائع کا زیادہ سے زیادہ حصہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل، دعوت الی اللہ اور تبلیغ دین، نصرتِ خدا و رسولؐ اور حمایت و اقامتِ دین، اور شہادتِ حق علی الناس، اور اظہارِ دینِ حق علی الدّین کلّہٖ، کے لئے وقف کر دے اور اس کے لئے محنت و مشقت، انفاق و ایثار، ترک و اختیار، ابتلا و آزمائش، صبر و مصابرت، استقامت و مقاومت ــــــ الغرض ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل کے لئے مقدور بھر ہمت و عزیمت کی راہ اختیار کرے۔ یہ تمام فرائض ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد اور مطابق وسعت و قوت عاید ہوتے ہیں اور ان کی انجام دہی میں ہی بندے کی وفاداری کا اصل امتحان ہے!

و : خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے اور "اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا" کے پیشِ نظر پورے احساسِ مسئولیت کے ساتھ عہد کرے کہ اپنے فرائضِ دینی کی انجام دہی کے لئے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کہ "اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"[1] کے مطابق تنظیمِ اسلامی کے نظم کی پوری پابندی کرے گا۔

---

[1] عن الحارث الاشعریؓ، مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد، مستدرک حاکم۔

تشریح: یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ **تنظیم اسلامی**، نہ عام معنی میں دنیوی یا سیاسی جماعت ہے نہ محدود مفہوم میں مذہبی تنظیم بلکہ یہ ایک ہمہ گیر "دینی جماعت" ہے لہٰذا اگرچہ یہ خیال کرنا تو غلطی ہی نہیں عظیم گمراہی ہوگی کہ یہ اُس "**الجماعۃ**" کے حکم میں ہے جس میں شمولیت اسلام میں داخلے اور جس سے علیحدگی کفر کے مترادف ہے اور جس کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "**مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ**" یعنی جو اس سے علیحدہ ہوگا وہ علیحدہ ہی جہنم میں جھونک دیا جائے گا ——— تاہم اس کے نظم کو عام معاشرتی و ثقافتی انجمنوں یا طبقاتی و پیشہ ورانہ تنظیموں یا سیاسی و قومی جماعتوں کے قواعد و ضوابط کی پابندی پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی "**اطاعت فی المعروف**" ——— "**سمع وطاعت**" کے خالص اسلامی اور ٹھیٹھ دینی اصول کے مطابق تمام شرکائے تنظیم پر واجب ہوگی۔

ضمیمہ

عہدنامۂ رفاقت تنظیم اسلامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں نے تنظیم اسلامی کے دستور کی دفعہ ۲ کو حتی الامکان اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور میں:

ا : پورے شعور و ادراک کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ:

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَآئِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ، اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ ۔

ب : کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے جملہ مضمرات و مقتضیات کے فہم و شعور کے ساتھ گواہی دیتا ہوں کہ:

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ

ج : ہر قسم کے کفر اور جملہ انواع و اقسام شرک اور تمام رذائل و ذمائم اخلاق سے شعوری طور پر اعلانِ براءت کرتا ہوں :

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ شَیْئًا وَّاَنَا اَعْلَمُ بِہٖ وَاَسْتَغْفِرُکَ لِمَا لَا اَعْلَمُ بِہٖ تُبْتُ عَنْہُ وَتَبَرَّاْتُ مِنَ الْکُفْرِ وَالشِّرْکِ وَالْکِذْبِ وَالْغِیْبَۃِ وَالْبِدْعَۃِ وَالنَّمِیْمَۃِ وَالْفَوَاحِشِ وَالْبُھْتَانِ وَالْمَعَاصِیْ کُلِّھَا

د : سابقہ زندگی کے تمام گناہوں پر نہایت الحاح و زاری سے بارگاہِ خداوندی میں مغفرت کا طلبگار ہوں اور آئندہ کے لئے کامل خلوص و اخلاص کے ساتھ توبہ کرتا ہوں :

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُہٗ عَمَدًا اَوْ خَطَاً سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ مِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ اَعْلَمُ وَمِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ لَا اَعْلَمُ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ وَسَتَّارُ الْعُیُوْبِ وَغَفَّارُ الذُّنُوْبِ

ھ : گہرے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ میں ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف اللہ کا ہو کر رہوں گا، رضائے الٰہی ہی میرا اصل مقصود و مطلوب ہوگی اور نجات و فلاح اخروی کا حصول ہی میرا اصل نصب العین ہوگا ــــ اور جس طرح میری نماز اور قربانی صرف اللہ کے لئے ہوگی اسی طرح میرے جسم و جان، مال و منال حتیٰ کہ زندگی اور موت سب اللہ ہی کیلئے ہونگے یعنی

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ہ ــــ اور ــــ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ

و : خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے اور "اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا" کو پیش نظر رکھتے ہوئے پورے احساسِ مسئولیت کے ساتھ عہد کرتا ہوں کہ اپنے فرائض دینی کی انجام دہی کے لئے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کہ "اَنَا اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" کے مطابق تنظیم اسلامی کے نظم کی پوری پابندی کروں گا۔

اللہ تعالیٰ مجھے اپنے اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

حصّہ سوم

مشتمل بر:-

ہیئتِ تنظیمی اور قواعد وضوابط

دفعہ ۳ ، ہیئتِ تنظیمی تنظیمی اعتبار سے پہلے تین سال ایک عبوری دور شمار ہوں گے جن کے دوران میں مقدور بھر سعی کی جائے گی کہ تجدید ایمان ، توبہ اور تجدید عہد کی وہ دعوت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا دی جائے جس کی تفصیل دفعہ ۲ میں دی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شامل ہوسکیں۔ اس عرصے کی تکمیل پر ایسے تمام لوگوں کا ایک عام اجتماع طلب کیا جائے گا جو "تنظیم اسلامی" کے لئے مستقل دستور طے کرے گا۔ گویا دفعات آئندہ میں جو تنظیمی ڈھانچہ دیا جا رہا ہے وہ صرف اس عبوری دور کے لئے شمار ہوگا۔

دفعہ ۴ ۔ مرکزی نظام (الف) ڈاکٹر اسرار احمد کو تنظیمِ اسلامی کے "داعی عمومی" کی حیثیت حاصل ہوگی اور وہ اس عبوری دور میں "اَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" کے وسیع تر اصول کے تحت تنظیم کے معاملات کو بھی چلائیں گے اور اس کی دعوت کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع تر حلقے تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایک معین مجلسِ شوریٰ کو بھی نامزد کرنے کے مجاز ہوں گے لیکن ان کو حق استقرار حاصل ہوگا۔

(ب) تمام رفقائے تنظیم داعیٔ عمومی کی "اطاعت فی المعروف" کے پابند ہوں گے۔

(ج) تنظیم اسلامی کا ایک "ناظم عمومی" ہوگا۔ جو جملہ تنظیمی اور دفتری امور کا ذمہ دار ہوگا اور براہ راست داعیٔ عمومی کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ ناظم عمومی کا تقرر داعیٔ عمومی کے مشورے سے کیا کریں گے۔

(د) تنظیم اسلامی کا ایک "ناظم بیت المال" ہوگا جو اعانتوں کی فراہمی، جملہ حسابات آمد و خرچ، بجٹ کی منصوبہ بندی نیز مقامی تنظیموں کے بیت المال کی جانچ پڑتال کا ذمہ دار ہوگا اور ناظم عمومی کی زیر نگرانی کام کرے گا۔ ناظم بیت المال کا تقرر بھی داعیٔ عمومی شوریٰ کے مشورے سے کیا کریں گے۔

(ہ) ناظم عمومی اور ناظم بیت المال کا تقرر عبوری دور کے لئے ہوگا۔ لیکن حسب ضرورت "داعیٔ عمومی" ان تقررات میں ردّ و بدل کے مجاز ہوں گے۔

(و) تنظیم کا بیت المال ناظم عمومی اور ناظم بیت المال کی مشترک تحویل میں ہوگا۔ اس سے خرچ کے جملہ اختیارات داعیٔ عمومی کو حاصل ہوں گے۔ اگرچہ وہ براہِ راست ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرے گا بلکہ جملہ اخراجات اس کی نگرانی میں ناظم عمومی اور ناظم بیت المال کی وساطت سے ہوں گے۔ مرکزی بیت المال کے حسابات کی جانچ پڑتال کے لئے داعیٔ عمومی ہر سال ایک محاسب کا تقرر کریں گے۔

(ز) جملہ شرکائے تنظیم کا ایک سالانہ اجتماع ماہ مارچ یا اپریل میں ہوا کرے گا۔ الّا آنکہ کوئی مجبوری حائل ہو جائے۔

دفعہ-۵، مقامی نظم

(الف) تنظیم کے شرکاء "رفیق" کہلائیں گے۔

(ب) جس مقام یا آبادی میں تنظیم کا صرف ایک ہی رفیق ہوگا وہ "منفرد رفیق" کہلائے گا اور براہِ راست ناظم عمومی سے رابطہ رکھے گا۔

(ج) جس مقام یا آبادی میں ایک سے زائد رفیق ہوں گے وہاں مقامی تنظیم قائم ہو جائے گی اور وہاں داعیٔ عمومی مقامی رفقاء کے مشورے سے کسی رفیق کو "داعیٔ مقامی"

کی حیثیت میں نامزد کردے گا۔ جس کی اطاعت فی المعروف مقامی رفقاء پر لازم ہوگی اور جو جملہ تنظیمی معاملات میں ناظم عمومی کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

(د) مقامی تنظیم کا اپنا "مقامی بیت المال" ہوگا جس کے لئے ایک ناظم کا تقرر ناظم عمومی کرے گا۔ مقامی بیت المال داعی مقامی اور ناظم مقامی بیت المال کی مشترکہ تحویل میں ہوگا اور یہ دونوں منصب کبھی ایک شخص میں جمع نہیں ہوں گے۔ مقامی بیت المال سے خرچ کا اختیار داعیٔ مقامی کو ہوگا۔ اور اس کے حسابات کی جانچ پڑتال وقتاً فوقتاً ناظم مرکزی بیت المال کرتا رہے گا۔

(ھ) ہر مقامی تنظیم ہر ہفتے ایک اجلاس عام اور ایک خصوصی اجتماع لازماً کرے گی۔

اجلاس عام میں مطالعۂ قرآن، مطالعۂ حدیث و سیرت اور عام دعوتی لٹریچر کا مطالعہ شامل ہوں گے۔ اس میں شرکت کی دعوت عام ہوگی اور اجتماع خصوصی میں رفتارِ کار کا جائزہ لیا جائے گا نیز باہمی مشورہ و محاسبہ ہوگا اور مرکزی دفتر سے آمدہ ہدایات پیش کی جائیں گی اس میں صرف رفقائے تنظیم ہی شامل ہو سکیں گے۔

دفعہ۔ ۷ ، نظامِ مالیات

(الف) تمام رفقائے تنظیم اپنے صدقاتِ واجبہ یعنی زکوٰۃ و عشر یا تو تنظیم کے بیت المال میں جمع کرائیں گے یا اگر ان کے قریبی رشتہ داروں اور پڑوسیوں میں مستحقین موجود ہوں تو ان کو پہنچا کر اس کا حساب بہر صورت تنظیم کے سامنے پیش کر دیں گے۔

(ب) ہر رفیق اپنے آپ کو پابند سمجھے گا کہ کچھ نہ کچھ صدقاتِ نافلہ بھی آیۂ بر (سورۃ البقرہ ۔ ۱۷۷) کے مطابق ہر ماہ ضرور کرے۔ لیکن یہ ایک راز رہے گا اس کے اور اللہ تعالیٰ کے مابین۔

(ج) تنظیم اپنے اخراجات کے لئے تمام تر انحصار اپنے رفقاء ہی کے جذبۂ انفاق پر کرے گی اور عام چندے کی اپیل نہیں کرے گی۔

(د) دعوتی اور تنظیمی اخراجات کے لئے سرمائے کی فراہمی کے لئے انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں ہر رفیق کوشش کرے گا کہ اپنی کل آمدنی کے کم از کم عشر (دسویں حصے) کے

لگ بھگ ضرور تنظیم کو ادا کرے۔

(ہ) منفرد رفقاء اپنی ماہانہ اعانتوں کا نصف مرکزی بیت المال میں جمع کرائیں گے اور نصف دعوتی کاموں پر خرچ کیا کریں گے جس کا حساب وہ مرکز کو بھیجا کریں گے۔ مقامی تنظیموں سے وابستہ رفقاء اپنی پوری اعانتیں مقامی بیت المال میں جمع کرایا کریں گے۔

(و) ہر رفیق کے صدقات واجبہ مرکزی بیت المال میں جمع ہوا کریں گے منفرد رفقاء یہ صدقات واجبہ براہ راست اور مقامی تنظیموں سے وابستہ رفقاء مقامی بیت المال کے توسط سے ادا کیا کریں گے۔

(ز) مقامی تنظیمیں اپنی کل اعانتوں کی آمدنی کا ایک تہائی لازماً مرکزی بیت المال کو منتقل کر دیں گی۔

دفعہ۔ ۷، طریق شمولیت جو بھی بالغ مسلمان تنظیم کے دستور اساسی اور ہیئت تنظیمی سے کلیتہً اتفاق رکھتا ہو اور پورے شعور کے ساتھ اپنے دینی فرائض کو انجام دینے کا عزم رکھتا ہو اور اس کام کے لئے تنظیم کا رفیق بننے کی خواہش رکھتا ہو تو اُسے تنظیم میں شمولیت کیلئے ایک درخواست دینی ضروری ہوگی اور داعئ عمومی پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد کہ یہ صاحب تنظیم کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں اور ان کے لئے جدوجہد کا واقعی عزم بھی رکھتے ہیں اور ان کی زندگی میں کوئی چیز دستور کی کسی شق کے خلاف موجود نہیں ہے درخواست کی منظوری دیں گے۔ جس پر وہ صاحب کسی مقامی تنظیم کے اجتماع میں، یا داعئ عمومی کے روبرو یا استثنائی حالات میں بذریعہ ڈاک عہد رفاقت کر کے تنظیم میں شامل ہو سکیں گے۔

دفعہ۔ ۸، اخراج عن التنظیم اگر کسی رفیق کے بارے میں یہ محسوس کیا جائے کہ اس کی زندگی میں کوئی چیز دستور کے خلاف موجود ہے یا اسے تنظیم کے مقاصد سے عملی دلچسپی نہیں ہے یا وہ تنظیم کے نظم کی پابندی نہیں کرتا تو داعئ عمومی رفقاء کے مشورے

سے اسے تنظیم سے خارج کر سکیں گے اور ضرورت داعی ہوئی تو اس امر کا اعلانِ عام بھی کر دیا جائے گا۔

دفعہ ۹ دستور میں ترامیم تنظیم اسلامی کے اس اساسی دستور کی کسی دفعہ یا ذیلی شق میں ترامیم تنظیم کے اجلاس عام کی منظوری سے کی جا سکیں گی۔

ڈاکٹر اسرار احمد

کے جماعت اسلامی سے تنظیم اسلامی تک

کے ذہنی سفر کی تفاصیل سے آگاہ ہونے کے لئے حسب ذیل مطبوعات کا مطالعہ لازمی ہے

۱۔ تحریک جماعت اسلامی۔ ایک تحقیقی مطالعہ	قیمت -/۶ روپے
۲۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام	" -/۱ "
۳۔ دستور مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور	" -/۵۰ "
۴۔ ماہ نامہ میثاق بابت ستمبر تا دسمبر ۷۴	" ۴/۵۰ "
۵۔ " " " اکتوبر تا دسمبر ۶۸	" -/۳ "

مزید برآں

۵۷-۵۶ء میں جماعت اسلامی میں پالیسی کے بارے میں اختلاف نے جو ہنگامہ خیز صورت اختیار کی تھی اور جس کے نتیجے میں بہت سے مخلص رہنما اور سرگرم کارکن جماعت سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہو گئے تھے اس کی تفصیلات ڈاکٹر اسرار احمد نے

" نقض غزل "

کے عنوان سے تحریر کی تھیں جو ماہنامہ میثاق، کے ۶۷-۶۶ء کے بعض شماروں میں شائع ہوئیں جو ایک محدود تعداد میں موجود ہیں۔ اور فی سیٹ -/۷ روپے میں حاصل کیے جا سکتے ہیں

مینجر، مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی ۱۲-افغانی روڈ سمن آباد، لاہور

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

تنظیمِ اسلامی کا ترجمان

ای

دعوتِ تجدیدِ عہدِ الست و میثاقِ ایمان کا علمبردار

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر:

ڈاکٹر اسرار احمد

داعیٔ عمومی تنظیمِ اسلامی

وصدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

چندہ سالانہ ——— -/ ۱۵ روپے

یکے از مطبوعات

مرکزی مکتبہ تنظیمِ اسلامی

۱۲- افغانی روڈ، سمن آباد، لاہور

(بقیہ عرض احوال)

تنظیم کی شرکت لازمی ہے ۔ روزانہ شام کو عصر تا عشاء درس قرآن کا عام پروگرام رہے گا۔ اور صبح ۹ تا ایک بجے بعد دوپہر تنظیم کی اقامتی تربیت گاہ کا پروگرام رہے گا ۔ مزید بر آں قیام اللیل کا خصوصی پروگرام بھی رکھا جائے گا جس میں ان شاء اللہ تعالیٰ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے معمول کے مطابق روزانہ ایک حزب کے حساب سے ایک ہفتے میں پورا قرآن ختم کیا جائے گا ۔

راقم کے زیر اہتمام قرآنی تربیت گاہوں کے سلسلے کی پہلی کڑی وہ دس روزہ تربیت گاہ تھی جو مسجد خضراء سمن آباد لاہور میں ۱۳ تا ۲۲ اگست ۷۶ء منعقد ہوئی تھی ۔ اس کا افتتاح مولانا اصلاحی مد ظلہ نے فرمایا تھا ۔ ان کا وہ بصیرت افروز خطبہ جو انہوں نے اس موقع پر ارشاد فرمایا تھا ”کلا انها تذکرہ“ کے عنوان سے اس اشاعت میں شامل کیا جا رہا ہے ۔ مولانا کے اس مختصر خطاب میں غایت درجہ اختصار کے ساتھ سلسلۂ تعلیم و تعلم قرآن سے فریضۂ شہادت علی الناس اور تحریک اقامت دین تک کے جملہ مراحل کا ذکر انتہائی منطقی ربط کے ساتھ موجود ہے لہذا اس اشاعت کا ’تذکرہ و تبصرہ، اسی کو شمار کیا جائے ۔

خاکسار : اسرار احمد عفی عنہ

ماہنامہ میثاق لاہور

کی اشاعت خصوصی مشتمل بر رپورتاژ و مقالات

تیسری سالانہ

قرآن کانفرنس

ایک محدود تعداد میں دستیاب ہے ۔

صفحات ۲۱۰ ——— قیمت فی نسخہ -/۶ (محصول ڈاک علاوہ)

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۔ لاہور

Regd. L. No, 760

Monthly MEESAQ Lahore

Vol. 24 | AUGUST, 1976 | No.

جماعتِ اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
- قیامِ پاکستان کے بعد اس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ اور
- اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریکِ جماعتِ اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے ایم بی بی ایس

سابق ناظمِ اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان و امیرِ جماعت اسلامی منٹگمری

قیمت فی نسخہ -/٦ (محصول ڈاک علاوہ)

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۱۲- افغانی روڈ - سمن آباد - لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد (ناشر) نے باہتمام چوہدری رشید احمد (طابع) مکتبہ جدید پریس، نوع فاطمہ جناح سے چھپوا کر مکتبہ تنظیم اسلامی - ۱۲- افغانی روڈ، سمن آباد لاہور سے شائع کیا۔